ممتاز افسانہ نگاروں کے

نمائندہ مختصر افسانے

مع تبصرہ

مرتبہ
محمد طاہر فاروقی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ایڈیشن ---- ۱۹۸۴ء
تعداد ---- ۱۰۰۰
قیمت ---- ۷/۰۰

کتابت : ز۔ رشید
مطبع : تاج آفسٹ پریس، الہ آباد

EBH
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

فہرست مضامین

تعارف ---------- ۵
مختصر افسانے کی تعریف ---------- ۶
اردو میں مختصر افسانے کا ارتقاء ---- ۷

۱	نمک کا داروغہ ---- پریم چند ----	۱۳
۲	آئی۔ سی۔ ایس۔ ---- علی عباس حسینی ----	۲۷
۳	جینے کے لئے ---- سہیل عظیم آبادی ----	۴۶
۴	کالے صاحب ---- اپندر ناتھ اشک ----	۵۸
۵	فٹ پاتھ ---- اختر اورینوی ----	۷۱
۶	اٹھارہ آنے ---- اختر انصاری ----	۷۳
۷	صرف ایک آنہ ---- کرشن چندر ----	۹۵
۸	خودکشی ---- سعادت حسن منٹو ----	۱۰۹
۹	گرہن ---- راجندر سنگھ بیدی ----	۱۱۹
۱۰	چوتھی کا جوڑا ---- عصمت چغتائی ----	۱۳۲

تعارف

ادب سائنس نہیں ہے اس لئے اس کو سائنس کے معیاروں سے نہیں جانچا جاسکتا اور نہ اس کی یا اس کی کسی صنف کی تعریف ایک دو جملے میں ہوسکتی ہے۔ یہی صورت حال مختصر افسانے کے سلسلے میں بھی ہے۔ تاہم اگر مختلف پہلوؤں سے اس پر روشنی ڈالیں تو شاید ہم یہ سمجھ سکیں کہ مختصر افسانہ کسے کہتے ہیں۔

مختصر افسانے کی تعریف

ایڈگر ایلن پو نے اس کی تعریف کرنے کی کوشش ہی تو کی تھی جو یہ کہا تھا کہ "یہ ایک ایسی نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے دو گھنٹے تک کا وقت لگے گا۔" لیکن اس تعریف میں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی کہ افسانے کے فنی اور تکنیکی تجزیے کا سرے سے فقدان ہے۔ سامرسٹ مام نے تو اس وقفے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ مام کا خیال ہے کہ مختصر افسانہ اتنا مختصر ہوسکتا ہے کہ اسے دس منٹ میں پڑھ لیا جائے اور اتنا طویل کہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ختم ہو جائے۔" لیکن اس سے قطع نظر ہم ان اسباب کا مطالعہ کریں جن کی بنا پر مختصر افسانہ وجود میں آیا تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ مختصر افسانہ کسے کہتے ہیں اور پھر ہمیں یک سطری تعریف کی ضرورت نہ پڑے گی۔

موجودہ صنعتی زندگی کی مصروفیت نے مختصر افسانے کی مقبولیت میں بڑا زبردست اضافہ کیا ہے۔ پھر اشاعتی سہولت نے بھی مختصر افسانے کے فروغ میں مدد دی

مختصر افسانہ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ ہر افسانہ اپنے گنتی کے الفاظ رکھتا ہے۔ افسانے کا فن اس کا متقاضی ہے کہ افسانہ نگار دریافت کرے کہ افسانے پر کتنے لفظوں کا بوجھ رکھا جاسکتا ہے۔ ایچ۔ ای۔ بیٹس نے اپنی کتاب "دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں یہ بات کہی ہے کہ کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے ایک مزید تنکا اڑا اڑا دھم کر کے سب کو گرا سکتا ہے۔ اس لئے افسانہ نگار کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ کس وقت اس کی بات پوری ہو گئی اور اب کہاں اس کو اپنا قلم روک دینا چاہئے۔ افسانے میں ایک قسم کی وحدت ہوتی ہے اس لئے یہاں جملوں سے لے کر الفاظ تک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی بات غیر ضروری نہ کہی جائے۔ جو زبان لکھی جائے وہ افسانے کی مناسبت سے ہو اور اس فضا کو پورے طور پر ظاہر کرے۔

مختصر افسانہ جادو کی بوتل نہیں ہے کہ جس میں دیو زادوں کو دھوئیں کی شکل میں مقید کیا جاسکے۔ اس میں کردار یا مختلف کرداروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مختصر افسانہ کوئی دستاویز نہیں ہے۔ یہاں تخیل کے ذریعے تصویریں بنائی جاتی ہیں لیکن اس کے لئے افسانہ نگار میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ہر افسانے کی اپنی تکنیک اور اس کا اپنا فن ہوتا ہے اور اس کی دریافت افسانہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ افسانہ نگار کو اپنے مخصوص افسانے کے اسلوب کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسے اسلوب پر بھی اتنی ہی توجہ دینا چاہئے جتنی خام مواد پر۔ اس اسلوب کے اندر لچک ہونا چاہئے کہ ضرورت کے مطابق اسے موڑا جاسکے۔

افسانہ، انسانی تجربات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے۔ افسانہ انسان اور اس کے سماج کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔ اس لئے وہ سماج کے مسائل سے کترا کر نہیں نکل سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار اپنے مخصوص زاویئے سے اس کو دیکھنے کی کوشش

کرتا ہے۔ افسانہ واقعیت کا اظہار ہے جسے ہم شاعرانہ حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شاعرانہ حقیقت افسانے کے ذریعہ بڑی کامیابی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر ہر چیز فرضی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام اور مقام کے علاوہ کوئی چیز بھی فرضی نہیں ہوتی اس لئے کہ تمام واقعات زندگی کے اپنے دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ واقعات چاہے اس شکل میں نہ پیش آئے ہوں لیکن اس کا تجربہ انسانی معاشرے کا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ افسانہ نگار کے یہاں جتنی سچائی اور شدت کے ساتھ پیش آئے گا افسانے کی تکنیک اس کو اسی انداز سے اپنے اندر جذب کرے گی۔

اردو میں مختصر افسانے کا ارتقاء

اردو افسانے کو ابھی سو سال بھی پورے نہیں ہوئے لیکن اس مختصر عرصے میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو افسانہ ہندوستان کے بدترین اقتصادی دور کی پیداوار ہے۔ معاشرے میں تیزی سے تبدیلی بھی نہیں ہو رہی تھی اس لئے اردو افسانے نے ان مسائل کی طرف اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس مختصر عرصے میں اس نے غیر معمولی ترقی کی۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار تھے یا نہیں لیکن انھوں نے یقیناً ایسے افسانے لکھنے شروع کئے جنھیں اردو کے افسانوی ادب کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ پریم چند ادب میں مقصدیت کے قائل تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے"۔ اور یہی تصور انھوں نے نہ صرف "سوز وطن" کے افسانوں میں پیش کی بلکہ یہ ان کی تمام تخلیقات میں نظر آتی رہی۔ شاید ہمارے قارئین بھی اس مقصدیت کی تلاش میں تھے اور وہ افسانے میں شعریت اور فنکارانہ عناصر کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ پریم چند کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ پریم چند کو جو زمانہ ملا وہ سیاسی ہنگاموں کا تھا۔ قومی آزادی کی تحریک بڑے زور شور سے آگے بڑھ رہی تھی۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہنگامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ چاہے قحط بنگال ہو یا ہندو مسلم فساد ہو یا اور کوئی ہنگامی مسئلہ ہو — ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی شعور کی بنا پر افسانے میں مقصدیت کو نمایاں کیا۔ ان کی بدولت پڑھنے والوں کا حلقہ بڑی تیزی سے بڑھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو شدت سے متاثر کرتے تھے۔ اسی لئے اردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی گہری ہے اور اردو کے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ ہی سہی، لیکن ان سے متاثر ضرور ہیں۔ اس زمانے میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی وغیرہ کے افسانے بے حد مقبول ہوئے۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ مختصر افسانہ ابتدا ہی سے تاریخ کے ادبی تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ تھا۔ اس کے بعد پھر اس میں موضوعات کا تنوع ہوا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی عوامل اس پر برابر اثر انداز ہوتے رہے۔ تقسیم ہند نے ایسے سیاسی مسائل پیش کئے جن کے اثرات نہ صرف سیاسی حد تک محدود رہے بلکہ اس نے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات بھی ڈالے۔ چنانچہ اردو افسانے ان سے متاثر ہوئے۔ فسادات پر اردو میں بہترین افسانے لکھے گئے — کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد وغیرہ نے اس موضوع پر بہترین افسانے لکھے۔ تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان میں مہاجرین کے مسائل کھڑے ہوئے۔ لوگ بڑے پیمانے پر ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلے گئے۔ چنانچہ ہجرت کے مسائل اردو میں در آئے۔ اس موضوع پر قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین اور دوسرے افسانہ نگاروں نے بڑے خوبصورت افسانے لکھے جو اردو ادب میں ہمیشہ بڑی دلچسپی اور شوق سے

پڑھے جائیں گے۔ افسانے میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن یہ تبدیلیاں عام طور پر تکنیک میں تنوع کی شکل میں سامنے آرہی ہیں۔ اب افسانے میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ علامتی انداز بھی جھلکنے لگا ہے۔ آج کا نیا افسانہ نئی جہت سے آشنا ہو رہا ہے۔ اردو افسانے کی تکنیک میں نت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ افسانے کے فنی لوازمات روز بروز بدلتے جا رہے ہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ قصہ چاہے کسی ترکیب سے لکھا جائے لیکن قصہ کا قصہ ہونا ضروری ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جیسا چاہیں بیان کریں لیکن افسانے میں افسانہ ہی نہ ہو تو آپ کو اس کا کوئی اور نام رکھنا پڑے گا۔

تاہم نئے افسانے کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھا جائے۔ چاہے بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال کے افسانے قصۂ پارینہ ہی کیوں نہ معلوم ہوں لیکن ان کو بھی گاہے گاہے پڑھنا چاہئے کہ یہ افسانے نہ صرف ایک تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں بلکہ ان کے اندر ماضی کی روح کے ساتھ ساتھ ہمارے عہد کے دل کی دھڑکن بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ افسانے ہمارا محض تاریخی ہی نہیں تہذیبی سرمایہ بھی ہیں۔

اطہر پرویز
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پریم چند

(تبصرہ)

پریم چند کے والد کا نام عجائب لال تھا جو بنارس کے قریب موضع پانڈے پور میں رہا کرتے تھے۔ چونکہ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے اس لئے ان کی تعلیم مکمل طور پر نہ ہو سکی۔ صرف انٹرنس تک پڑھا اور محکمۂ تعلیمات میں مدرسوں کے ڈپٹی مقرر کر دیئے گئے معائنوں کے سلسلہ میں ان کو گاؤں گاؤں جانا پڑتا تھا۔ مگر اس کے باوجود پڑھنے کا شوق تھا۔ اس لئے پرائیویٹ طور پر پڑھتے رہے اور آخر کار اپنی مسلسل محنت اور کاوش کے بعد بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ کہانیاں ابتدا ہی سے لکھنے لگے تھے جو کانپور کے رسالہ 'زمانہ' میں چھپا کرتی تھیں۔ اس رسالہ کی بدولت پریم چند کی کہانیوں سے ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ روشناس ہوا۔ اور ان کی پسندیدگی نے ہی پریم چند کی ہمت افزائی کی اور انھیں اچھا افسانہ نگار بنا دیا۔

آپ نے 'پریما'، 'بازارِ حسن'، 'سیوا سدن'، 'پریم آشرم'، 'رنگ بھوم'، 'کایا پلٹ'، 'گئودان'، وغیرہ ناول لکھے ہیں، 'پریم پچیسی' اور 'پریم بتیسی'، ان کے قصوں کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے افسانے لکھے جو کئی کئی دفعہ شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے

'کربلا' ایک تاریخی ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ ان کے افسانے اردو ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔

آپ کے افسانوں کا مخزن دیہات ہے۔ وہاں کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی سیرت سچائی اور ایمانداری اور کبھی کبھی بعضوں کی بے ایمانی چالاکی، فتنہ پردازی کا نقشہ پریم چند کے افسانوں کی جان ہے۔ دیہات والوں کی عام زندگی کا نقشہ دیکھنا ہو تو ان افسانوں کو دیکھئے جن میں لوگوں کی بیچارگی کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ غریب کاشتکاروں کو کبھی پولیس، کبھی زمیندار، کبھی تحصیل کے عملے کبھی قحط سے ایسا سابقہ رہتا ہے کہ آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان واقعات کو ایسے دردناک پیرائے میں منشی جی نے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر دل بھر آتا ہے۔

ہر چیز کو جیسا وہ دیکھتے ہیں ویسا ہی اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روئداد قصہ کو پریم چند اسی رو پر جانے دیتے ہیں جو اس کی واقعیت صحیح طور پر طلب کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی حد کے اندر پلاٹ کو رکھتے ہیں کہ سادگی و اصلیت کے ساتھ قصہ کی بناوٹ کا پورا پورا لطف قایم رہے۔ پریم چند کے افسانے انسانی کردار کے روشن آئینے ہیں۔

منشی جی کی زبان نہایت شائستہ اور رواں ہے۔ سادگی اس کا جوہر ہے۔ یوں تو فارسی و ہندی کے الفاظ عام طور پر وہ لاتے ہیں مگر اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے بعض اوقات ایسے ہندی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو اردو میں رائج نہیں۔ لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔ کبھی کبھی نئے نئے تشبیہ اور استعارے سے زبان میں ایک لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ منشی پریم چند کا ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا۔

○

نمک کا داروغہ

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خدا داد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازۂ صدر بند پا کر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوار گری کا معزز اور پر منفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے۔ اور اس محکمہ کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی۔ لوگ حسن و عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قائل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصہ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے بیٹا! گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہئے۔ ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو ماہوار مشاہرہ

پورنماشی کا چاند ہے۔ جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے۔ اسی لئے اس میں برکت نہیں رہتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لئے اس میں برکت ہوتی ہے اور تم خود عالم و فاضل ہو تمھیں کیا سمجھاؤں یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے انسان کو دیکھو اس کی ضرورت کو دیکھو موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقبال اپنا رفیق، اپنی ہمت اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبئ قسمت ساتھ تھی۔ صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے مشاہرہ معقول بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے کلوار کی تسکین و تشفی کی سندلی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ گرمی ہو گئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے اور رات کا وقت تھا۔ نمک کے برقنداز اور چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے لیکن اسی عرصہ میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا

ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے بیٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور و غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اٹھ بیٹھے۔ اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں۔ اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں۔ شبہ کو استدلال نے تقویت دی وردی پہنی۔ طمنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آپہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلف محبوب سے بھی زیادہ طولانی پل سے اتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے "کس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں تب اگلے گاڑیبان نے جواب دیا۔

"پنڈت الوپی دین کی"

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج کے"

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقہ کا سب سے بڑا ممتاز زمین دار تھا۔ لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں نمک کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحب اثر بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا کہاں جائیں گی۔ جواب ملا "کانپور کو"

لیکن اس سوال پر کہ ان میں ہے کیا؟ ایک خاموشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا

زور سے بولے "کیا تم سب گونگے ہو گئے" ہم پوچھتے ہیں "ان میں کیا لدا ہوا ہے؟"

(۳)

جب اب کی بھی کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا۔ اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے مہاراج درگو نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں۔"

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا عملی تجربہ تھا وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا۔ دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور ان کا خیال بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے "اچھا چلو ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے، بابو جی "اشیرباد" ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیئے۔"

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا بے اعتنائی سے بولے "سرکاری حکم" الوپی دین نے ہنس کر کہا "ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو، ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے۔ کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔

میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔"

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانتداری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے "ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے جمعدار بدلو سنگھ تم انھیں حراست میں لے لو۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں"

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی کا پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرط رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہ پایا تھا۔ سکتے میں رہ گئے۔ خیال کیا کہ یہ ابھی طفل مکتب ہے دولت کے ناز انداز سے مانوس نہیں ہوا۔ الھڑ ہے جھجکتا ہے۔ زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز میں بولے "بابو جی! ایسا ظلم نہ کیجئے ہم مٹ جائیں گے عزت خاک میں مل جائے گی۔" "آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہوا تھوڑا بہت انعام واکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑے ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجہ میں کہا "ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے۔ الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا، اعتماد نفس اور غرور دولت کو سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے "لالہ جی ایک ہزار روپے کے نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو۔

آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔"

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ ایک ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ دولت فرض کی اس خامکارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی، اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کر کئی حملے کئے ایک سے پانچ ہزار تک پانچ سے دس، دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یکہ و تنہائی پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا رہا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔ اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بیکسی کے ساتھ بولے "بابو صاحب" ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔

"غیر ممکن"

"تیس ہزار"

"غیر ممکن"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں"

چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں۔ غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۴)

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچہ بچہ کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں۔ گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا۔ فرضی روزنامچے بھرنے والے حکام سرکار۔ ٹکٹ کے بغیر سفر کرنے والے بابو صاحبان جعلی دستاویزیں بنانے والے ساہوکار یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے۔ اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غم و غصہ تو سارے شہر میں ہل چل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوق نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو، کثرت ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے۔ حکام ان کے قدر شناس عملے نیاز مند، وکیل اور مختار ان کے ناز بردار اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انھیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو۔ کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار

ہونے لگے۔ فوراً اس حملہ کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا، سچائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں۔ لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان سے کھنچا ہوا نظر آتا تھا۔ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور سے ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردہ میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی۔ وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہو گیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عاید ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناش نوجوان ہے۔ لیکن صیغۂ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز و ادراک کو مغلوب کر دیا۔ اے آئندہ ہشیار رہنا چاہیئے۔ وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ جو انھوں نے روپے برسائے سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا۔ اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے نکلے نگاہیں غرور سے لبریز طعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے

چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کئے لیکن ایک اشارہ اس وقت اس نشۂ پر غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمہ میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دے دیا تھا۔ انصاف، علم اور پنج حرفی خطابات لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گذرا تھا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے بوڑھے منشی جی پہلے سے بدظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کلوار اور بوجڑ کے تقاضے سہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس سوکھی تنخواہ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدے دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا۔ اور آپ دیانتدار بننے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں چراغ ضرور جلائیں گے لعنت ایسی سمجھ پر پڑھا نا لکھا ناسب اکارت گیا۔ اسی اثناء میں بنسی دھر خستہ حال مکان پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے رو داد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے غصہ میں کچھ سخت سست بھی کہا اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہ تھا کہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے کئی دن تک سیدھے منہ بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے بیگانوں کی ترشروی اور بیگانوں کی دلدوز ہمدردیاں سنتے سنتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازہ پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رکا۔ سبز اور گلابی پردے پھپھائیں نسل کے بیل۔ ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے۔ سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کی اور مدبرانہ درفشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کونسا منہ دکھاؤں۔ منہ میں کالک لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے ناخلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا۔ مصافحہ کیا لیکن شان خودداری لئے ہوئے فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زباں شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی اپنے والد بزرگوار کا خلوص سخت ناگوار گذرا، یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمایئے۔

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دے دیا۔ انداز حیرت سے بولے ایسی اولاد کو کیا کروں الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا" فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پا کر آپ کو پرماتما کا شکر گذار ہونا چاہئے دنیا میں کتنے ایسے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے، زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے۔ میں نے سب

کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں۔ بنسی دھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے۔" یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے فرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں جو آپ کا ارشاد ہوگا بحد امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا۔"

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا" دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔" بنسی دھر نے جواب دیا میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی۔ اس میں دریغ نہ کروں گا۔

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجئے۔ میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا دروازہ سے نہ ہٹوں گا۔"

منشی بنسی دھر نے مختار نامہ کو پڑھا تو شکریہ کا آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انھیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے روزانہ خرچ الگ سواری کے لئے گھوڑے اختیارات غیر محدود، کانپتی ہوئی آواز سے بولے" میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے ان عنایاتِ بیکراں کے قابل سمجھا۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔ الوپی دین ہنس کر بولے" اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ

کیجئے۔" بنسی دھر نے متین انداز سے کہا یوں میں آپ کا غلام ہوں آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست، نہ وہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی۔ اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں۔ اب حسن تقدیر اور حسن اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم و فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامل نہ کیجئے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے۔ میری پرماسے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا دہی ندی کے کنارے والا بے مروت، سخت زبان، تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسوں ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔

الوپی دین فرط مسرت سے اچھل پڑے اور انھیں گلے لگا لیا۔

علی عبّاس حسینی

(تبصرہ)

طبع زاد افسانے لکھنے والوں میں علی عباس حسینی ایک خاص انداز کے مالک ہیں ان کے افسانوں کے مجموعے آئی سی ایس، باسی پھول، کچھ ہنسی نہیں ہے وغیرہ پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جذب کامل، رفیق تنہائی، اور انسپکٹر کی عید، فنی اعتبار سے مکمل ہیں۔

حسینی صاحب کے یہاں ایک قصہ گو کی طرح تفصیلات کی بھرمار ہے وہ جزئی باتوں کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے بعض اوقات معمولی باتوں کی تفصیل میں بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔ یہ تفصیل سیرت اور کردار کے سمجھنے میں مدد تو ضرور دیتی ہے لیکن کبھی کبھی بار خاطر بھی ہو جاتی ہے۔ آج کل بہت سے افسانہ نویسوں کی طرح علی عباس حسینی بھی مقامی رنگ کے دلدادہ ہیں۔ انھیں دیہات کی فضاؤں میں سکون ملتا ہے۔ وہیں کے لوگ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ وہیں کے رسوم اور اخلاق پر وہ روشنی ڈالتے ہیں۔ کھیت اور فصلوں کے بیانات ان کے یہاں نہایت دلکش انداز میں پائے جاتے ہیں۔

علی عباس کے افسانوں کے پلاٹ نہایت دلکش اور فطری ہوتے ہیں اور اصلاحِ معاشرت کا کوئی پہلو ایک ہلکے رنگ کی طرح پورے افسانے پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں یہ مقصد اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ محبت کو وہ ایک پاک مقصد جذبہ سمجھ کر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ہر جگہ اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بیان میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی سیرت نگاری ہے۔ ان کے کردار بعض خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور وہی قصہ کی ارتقائی منزلوں میں قصہ کی تکمیل میں اور ہر جگہ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کردار کے سمجھنے اور سمجھانے میں نفسیات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ علی عباس صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھ کر افسانہ کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں جگہ جگہ پر نفسیاتی صداقت کی کمی تھی وہاں صرف اثر پیدا کرنا مدنظر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے افسانوں میں یہ کمی دور ہو گئی اور تحریر کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری میں پختگی آ گئی۔

ظرافت اور مزاح لطیف کی چاشنی نے طرزِ تحریر کو بے حد شگفتہ بنا دیا ہے یوں تو ان کے یہاں ہر جگہ ایک درد کی کسک اور تڑپ نظر آتی ہے لیکن یہ ہلکا سا مزاح اسے فطری بنا دیتا ہے۔ زبان کی سادگی اور روانی افسانے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ حسینی صاحب بامحاورہ اور عام فہم زبان میں فلسفہ اور نفسیات کے مشکل مسائل حل کر دیتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب تشبیہ اور استعاروں کی مدد سے عبارت میں بے انتہا زور اور گداز پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے فارسی اور عربی کے نامانوس الفاظ سے کنارہ کشی کی ہے اور ہندی کے سبک اور خوب صورت الفاظ پسند کئے ہیں۔ لیکن دبی زبان سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کوشش میں اکثر انھوں نے ہندی کے نامانوس الفاظ سے کام لیا ہے۔

○

"آئی۔ سی۔ ایس"

وحید کا آئی سی ایس میں جانا بالکل داتا کی دین تھی ایک غریب دیہاتی زمیندار کا لڑکا جو گیارہ بارہ برس کے سن تک ایک چھوٹے مختصر اور تنگ کچے مکان میں پلا ہو جو گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، کبڈی، گیڑی اور آنکھ مچولی کھیلنے میں لگا رہا ہو، جس نے امیروں، چماروں اور کولیوں کے لڑکوں کے ساتھ ہر بڑے سے بڑے درخت پر چڑھ جانے اور چھپ بیٹھنے میں مہارت حاصل کی ہو جس نے سات برس کی عمر سے گائیں بھینسیں خود دوہی ہوں اور ان کا گوبر اپنے ہاتھ سے اٹھایا ہو۔ اور جس کے سب سے بڑے دوست چھوٹی امت کے لوگ رہے ہوں۔ وہ آج آئی۔ سی۔ ایس پاس ہو اور ہیٹ کوٹ پہنے صاحب بنا، دل تھم گیا مانگتا اور ہم نہیں جانتا بولنے کا فخر حاصل کرلے۔ واقعی بخشش الٰہی تھی یا حضرت موسیٰ کے لئے سنا تھا۔ وحید کے معاملہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ہم نے مانا کہ بارہ برس کے سن سے اس کندہ ناتراش کو ایک دور کے عزیز نے رحم کھا کر اپنے پاس رکھا، خراد پر چڑھایا اور آدمی بنایا مگر یہ سب رحمت باری اور فضل الٰہی تھا۔ اس نے اگر ان عزیز کے دل میں اولاد کی خواہش کے ساتھ ساتھ ان کی گود

بھی اولاد سے بھر دی ہوتی۔ تو پھر کیا ہوتا اگر وحید کی فطرت میں اثر قبول کرنے کا مادہ نہ ہوتا، اچھے خاصے جانور سے بھلا مانس انسان بننے کی صلاحیت ودیعت نہ کی ہوتی تو وہ کاہے کو اسکول یا کالج ہی سے اپنے کپڑوں اپنے فیشن اپنی تہذیب اپنے سلیقے اور اپنی ذہانت کے لئے مشہور ہوتا۔ پودے ایک زمین سے نکال کر دوسری زمین میں لگا دینے سے اپنی نوعیت اور جنس نہیں بدل دیتے نیم آم نہیں بن جاتی نہ گیندا گلاب ہو جاتا ہے۔

مگر یہاں وحید کے معاملہ میں تو محمد پور کیا چھوٹا اور الہ آباد کیا ملاکہ ایسا معلوم ہوا کہ شخصیت ہی دوسری ہو گئی جون بدل گئی جس طرح اس نے محمد پور کے پھٹے پرانے کپڑے اتارے اور الہ آباد کے نئے چمکتے بھڑکتے پہن لئے اسی طرح اس کی وہ بارہ برس تک کی طبیعت، ضد، جھلاہٹ، شرارت، بھدا پن، ہٹیلا پن، الھڑ پن، گنوار پن، بدتہذیبی، بداخلاقی، کج روی یا وہ گوئی، دریدہ دہنی، بیہودہ گوئی، کم عقلی، بدا طواری، دیر فہمی، بدشوقی اور موقع ناشناسی سب محمد پوری کپڑوں کے ساتھ اتر گئی۔ اور اس کی جگہ الہ آبادی کپڑوں کے پہنتے ہی متانت، سنجیدگی، خودداری، وقار، زود فہمی سگھڑاپا، جامہ زیبی، خوش مزاجی، معاملہ فہمی، سخن سنجی آ گئی۔ ہمارا یہ ادعا نہیں کہ یہ فرق فوراً پیدا ہو گیا تھا۔ یا واقعی ایک جگہ سے چھوٹتے۔ ایک گھر سے نکلتے اور دوسرے گھر میں داخل ہوتے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ نہیں اس تبدیلی میں سال دو سال لگے تھے۔ مگر پھر بھی یہ ایسا سریع اور عظیم انقلاب تھا جسے کایا پلٹ ہو جانا کہتے ہیں۔

بہر نوع، مالک کی دین کہئے یا وحید کی فطری صلاحیت و قابلیت ہوا ایسا ہی کہ وحید جس دن سے اسکول میں داخل ہوا اور جس دن تک وہ تعلیم پاتا رہا۔ ہمیشہ اپنے درجہ میں اوّل آیا۔ یہاں تک کہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد آئی۔ سی۔ ایس بھی ایسے اچھے

نمبروں سے پاس ہوا کہ نہ سعی و سفارش کی ضرورت ہوئی اور نہ خاندانی حقوق و خدمات گنانے پڑے اور دو برس انگلستان میں مزید تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا گیا وہاں کے قیام کے دوران میں ریاست مہیدر پور کے ایک رکن خاص صاحب زادہ شہاب الدین خاں سے ملاقات و راہ و رسم پیدا ہوئی اور اسی سلسلہ میں ان کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم سے بھی جو اس سال آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ میں نمایاں حیثیت سے کامیاب ہوئی تھیں روز روز ملنے جلنے نے کشش پیدا کی۔ صاحبزادہ کی اجازت اور جہاں آرا بیگم کی پسندیدگی سے اس نے وہیں بیاہ رچایا اور نئی دلہن ساتھ لے کر ہندوستان پلٹا چونکہ دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں افلاس اور دیہاتیت کا پول نہ کھل جائے۔ اس لئے ہندوستان میں پہنچنے اور دہلی حضور وائسرائے کے صدر دفتر میں تعیناتی کا درمیانی زمانہ ریاست مہیدر پور میں سسرال ہی میں بسر کیا اور گھر لکھ بھیجا "کہ میں فی الحال مکان نہیں آسکتا لیکن برابر والد کے لئے خرچ بھیجتا رہوں گا۔ کسی کو میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بوڑھا باپ دل مسوس کر، بوڑھی ماں رو دھو کر اور بھائی خفا ہو کر خاموش رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا گھر اس قابل نہیں کہ کوئی آئی۔ سی۔ ایس۔ آکر قیام کرے، وہ اسے خوب سمجھتے تھے کہ ان کا جھونپڑا کسی بیگم بہو اتارنے کے لائق نہیں۔ انھوں نے ٹھنڈی سانسیں بھریں آسمان کو دیکھا اور چھاتی پر سل رکھ لی۔

غرض بیگم نے نہ اپنی سسرال دیکھی اور نہ ساس سسر جیٹھ، دیوروں سے ملنے کی نوبت آئی کہ وحید دہلی میں لاٹ صاحب کے دفتر میں کام کرنے لگا۔ وہاں کے مشاغل بڑے بڑے آدمیوں سے ملنا جلنا۔ راجگان، مہاراج اور والیان ملک کی

پارٹیاں، ایٹ ہوم، ڈنر، سینما، تھیٹر، کھیل تماشے، غرض دلچسپیوں میں نہ کسی طرح کی کمی تھی اور نہ ان کی وجہ سے اتنی فرصت کہ نئے رشتہ داروں اور عزیزوں کی زیادہ فکر کی جائے۔ مگر بیگم کے لئے یہ دلچسپیاں ہو سکتیں تھیں۔ وحید کی ماں کے لئے تو نہیں اس نے تو وحید کو جنا تھا، اس کی مامتا کو بھلا کیسے چین پڑتا۔ وہ بیٹے کو خط لکھتی رہی بس اک نظر دکھا جانے کی خواہش تھی بہو کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنائیں تھیں۔ بیٹے کی شادی کے بارے میں بڑھیا نے نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا، اپنوں، پرایوں میں بہت سی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ مگر وہاں صاحب زادے خود ہی بیگم بیاہ لائے۔ شادی ایسے چپ چپاتے کرلی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور معلوم بھی ہوتا تو پہنچتی کیسے۔ کالے کوسوں دور سمندر پار، انگلستان میں، پھر سسرال اپنے میل کی نہ جوڑ کی وہاں روپیوں کی، عزت کی، شان و شوکت کی افراط تھی یہاں افلاس و تنگدستی، انگبیت کی بہتات بہو پڑھی لکھی آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ، لاٹ صاحب سے ہاتھ ملانے والی ساس جاہل، دیہاتن اور پردہ میں بیٹھنے والی اس سے ساس کی طرح پیش آنا، بہو بنا کر ملنا، ہاتھی سے گنا کھانا تھا۔ مور کی طرح ناچنے کو جی تو ضرور چاہتا تھا لیکن پاؤں کو دیکھ کر لاج بھی آتی تھی۔ صبر کی سل چھاتی پر رکھی۔ مگر یہ بوجھ اتنا بھاری تھا کہ پہلو میں درد ہونے لگا۔ اس بے چینی نے خط لکھنے پر مجبور کیا پہلے تو لڑکے ہی کو لکھتی رہی جب ادھر سے برابر ٹالنے ہی والا جواب ملا۔ تو پھر ایک دن حمید سے چھوٹے لڑکے کو پاس بلایا اور دل کی ساری کہانی بیگم بہو کو لکھوادی۔

بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لئے دل میں گھر کر گئی بیگم بہو کو لفظ لفظ میں خلوص سادگی اور سچائی کی عطر آگیں بوئے خوش آئی۔ وہ ہاتھ میں خط لئے بیساختہ

آئی۔ سی۔ ایس۔ وحید کے دفتر میں گھس آئیں اور اس کے سامنے سے فائلیں کھینچ کر بولیں۔

کیوں صاحب یہ آخر آج تک آپ نے مجھے میری سسرال کے لوگوں سے کیوں نہ ملایا۔ مسٹر وحید آئی۔ سی۔ ایس۔ بیگم کے اس طرح چین بجبیں آنے سے یوں ہی گھبرائے تھے، اس غیر متوقع سوال نے انھیں کچھ ڈرا سا دیا وہ ذرا اٹک اٹک کے بولے۔

"جب سے ہندوستان پلٹ کے آیا۔ تمہارے میکے گیا پھر وہاں سے ملازمت پر چلا آنا پڑا۔ یہاں کے کاموں میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ.....

وہ بات کاٹ کر بولیں کہ ماں باپ اور بھائیوں سے بھی نہ مل سکے۔ اور نہ بیوی کو ملا سکے۔ وحید کی ذہانت کام آئی اس نے ذرا مسکرا کر کہا "یہ آج دفعتاً آپ کو سسرال کیوں یاد آگئی" کیا کسی نے خط لکھا ہے۔؟

بیگم بولیں جی ہاں میں تو انسان ہوں ہی نہیں کہ مجھے کوئی فکر ہوتی بار ہا آپ سے پوچھا آپ نے کہا کسی دن اطمینان سے باتیں ہوں گی تو بتاؤں گا۔ شاید آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے یا اپنے گھر والوں کو جانور سمجھتے ہیں۔

وحید نے ذرا متانت سے کہا بھئی ہے تو یونہی کہ تم ان لوگوں سے مل کر کچھ خوش نہ ہو گی نہ وہ کچھ باتیں کرنا جانیں نہ آداب و تہذیب سے واقف نہ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ ہم لوگوں کا سا۔

بیگم نے تلخ مسکراہٹ سے کہا "اب آپ زیادہ ان کی تعریفیں بیان فرمانے کی زحمت نہ کیجئے۔ آج آپ کی والدہ کا خط آیا ہے۔ میں خود چل رہی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گی۔

وحید گھبرا گیا وہ جلدی سے بولا ارے تم وہاں چلوگی محمد پور۔

اس نے کہا کہ ہاں ہاں کیا کوئی وہاں کٹکھنا کتا چھوٹا ہوا ہے۔ کہ جاتے ہی مجھے کاٹ کھائے گا۔ اور یہ کہتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وحید دیر تک سناٹے میں رہا۔ جانتا تھا کہ گھر میں رہنے کی جگہ مشکل سے نکل سکے گی۔ بیگم مصر تھیں کہ میں ضرور جاؤں گی، کہاں قیام ہوگا۔ کیا انتظام! پھر جتنی ادھر تعلیم و شائستگی تہذیب و مدنیت تھی اتنی ہی ادھر جہالت غیر شائستگی اور دیہاتیت۔ خدا جانے بڑی بی نے کیا لکھوا دیا ہے کہ بیگم پر اس قدر اثر ہوا۔ آج تو پوری تریاہٹ کا مزہ آگیا۔ اس نے جلدی سے خطوں کا کاغذ کھینچا باپ کو خط لکھا۔ اسی وقت بینک گھر گیا وہاں سے تین سو روپیوں کے نوٹ لئے ڈاک خانہ سے رجسٹری لفافہ منگا کر بیمہ کر دیا۔ خط میں لکھا۔

" فوراً خانہ باغ کے احاطہ میں کموس کے کھمبے جڑوا کے ان پر بنگلہ نما پھوس کا چھپر ڈلوا دیجئے اور معمولی ٹٹروں کی دیواریں کھینچ کر اس کے اندرونی حصہ میں کئی کمرے بنوا دیجئے۔ بیگم آپ لوگوں سے ملنے آرہی ہیں۔ بس کوئی پندرہ دن میں ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ صحیح تاریخ سے بعد میں اطلاع دوں گا۔

جب بیمہ لگا چکا تو وحید نے اطمینان کی سانس لی اب بہت کچھ ذمہ داری اس کے سر سے ہٹ چکی تھی اب بس اتنی سی بات رہ گئی تھی کہ بیگم کو چھٹی نہ ملنے کا بہانہ کر کے پندرہ دن اور روکنا تھا۔ اس امر میں زیادہ دقت بھی نہ ہوئی اس لئے کہ بیگم نے سسرال چلنے کا قطعی فیصلہ سناتے ہی وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ متواتر کئی راتوں اور کئی دن وحید کو اپنے بڑے بھائیوں اور ان کی بیویوں کے نام اور حلیہ

ان کے بچوں کی تعداد، بہنوں اور ان کے شوہروں کے نام ان کی صورت شکل، بن بیاہے بھائی کی عمر، لیاقت، مزاج، طبیعت، قد و قامت بڑے میاں اور بڑی بی کی پسند کی چیزیں سب بتانا پڑیں۔ بیگم بات اور بات کی جڑ سب کچھ کھود کھود کر پوچھتی تھیں۔ بعض وقت ان کے سوالات کا جواب دیتے دیتے عاجز آجاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ بیگم کی اس غیر معمولی دلچسپی لینے کا نفسیاتی اثر ان پر بھی شروع ہوا۔ سفید رنگ کا خون بدلنے لگا۔ فطرت میں جو اپنوں سے اپنے ماں، باپ، بھائی بہن سے ہمدردی و محبت تھی اور جو آئی۔ سی۔ ایس۔ کے مخملی پردوں سے ڈھک گئی تھی جس پر انگلستان اور ہندوستانی سکریٹریٹ کے ماحول نے ایک نیا ملمع چڑھا دیا تھا بیگم کی کرید نے اس مخمل کو گھس ڈالا، بار بار کے سوال و جواب سے ملمع اتر گیا۔ خلوص و یگانگت جگہ جگہ سے جھلکنے لگی۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا جس کا بیگم کو بے چینی سے انتظار تھا یعنی وحید کی پندرہ دن کی چھٹی منظور ہو گئی اور سفر کے لئے اسباب بندھنے لگا۔ بیگم نے جانے کیا سمجھا تھا کہ دس بارہ ٹرنک اور سوٹ کیس کپڑوں سے بھر لئے تھے۔ وحید نے چلنے سے کچھ گھنٹے قبل اتفاق سے یہ سامان دیکھ لیا تھا۔ بڑی ردّ و کد کی مگر بکسوں میں کمی نہ ہوئی اور سب کے سب موٹر کے علاوہ کرائے کی لاری پر لاد کر اسٹیشن پہنچائے گئے۔

گاڑی چلی تو وحید کا پشت و پیش پھر بڑھا۔ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے گھر پر والدین نے بیگم کے لائق کوئی جگہ حسب ہدایت بنوائی بھی یا نہیں۔ بیگم کو ان دیہاتیوں کی باتیں پسند آئیں یا نہ آئیں۔ یا خود ان لوگوں کو بیگم کی بے پردگی بھائے یا نہ۔ وہ سب کے سب پرانے خیال کے، دقیانوسی مراسم کے پابند، رئیسوں، امیروں کا طور طریقہ انگلستان و

یورپ کی تعلیم و تربیت دیکھئے جوڑ کیسے بیٹھتا ہے۔ اور آپس میں کیسے نبھتی ہے۔ آگ و برف کا تال میل بیٹھے نہ بیٹھے۔ یہ جدھر بھی نظر کرتا۔ جس پہلو پر غور کرتا دشواریاں ہی دشواریاں دکھائی دیتیں۔ جی چاہتا بیگم کو سمجھائیں ان کو اس سفر کے نشیب و فراز سمجھائیں۔

مگر بیگم کی یہ حالت تھی کہ انھوں نے ابتدائے سفر سے ایک ناول شروع کیا تو راستے بھر اسی کو پڑھتی رہیں۔ سفر طویل تھا ایک دن اور ایک رات گاڑی پر دونوں رہے مگر سوائے کھانا کھانے کے اوقات کے کسی وقت باتیں کرنے کا موقع نہ ملا۔ ایک تو فرسٹ کلاس میں ہونے کی وجہ سے دونوں کے برتھ کافی فاصلہ پر تھے۔ دوسرے ان کے برتھ کے اوپر والے حصہ پر ایک انگریز دراز تھا۔ ایسی حالت میں نجی اور خانگی گفتگو ناممکن ہی نہیں بلکہ محال تھی۔ کھانے کی میز پر رسٹوران کار میں اس کا موقع نہ تھا۔ پاس ہی پاس مختلف میزوں پر دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے کس طرح یہ مسئلہ چھیڑ سکتا تھا؟ غرض محمد پور کا اسٹیشن آگیا اور یہ بیگم صاحبہ سے کچھ کہہ نہ سکے۔

وہاں اسٹیشن پر جو گاڑی رکی تو چھوٹا بھائی مع پینس اور آٹھ کہاروں کے دکھائی دیا۔ وحید نے بیگم سے جلدی سے کہا "یہاں شاید تمھیں پردہ کرنا پڑے"

انھوں نے کہا کہ میں پہلے ہی سے اس کے لئے تیار ہوں اور یہ کہتے ہی بکس کھول کر برقعہ نکال کر پہن لیا۔ وحید کو اس کی خبر بھی نہ تھی کہ وہ اتنا انتظام کئے بیٹھی ہیں۔ اس لئے اسے بہت ہی تعجب ہوا مگر چھوٹے بھائی کی گھبرائی ہوئی خوش صورت اور اسٹیشن پر گاڑی زیادہ نہ رکنے کے خیال نے گفتگو کا موقع نہ دیا اور ڈبے کے سامنے پینس لگتے ہی بیگم اس میں جلدی سے سوار کروائی گئیں۔ اور یہ مع اپنے بھائی کے بیل گاڑی پر اسباب لدوانے کے احکام صادر کر کے گھر کے تانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔

حمید اس کا بھائی اس سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ اس نے قصبہ کے ورنا کیولر اسکول سے اردو مڈل پاس کر کے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ اور کاشتکاری میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس لئے اس میں نہ تو وہ کلچر تھا جو ایک تعلیم یافتہ شخص میں پایا جاتا ہے۔ اور نہ اس میں وہ تہذیب و شائستگی تھی۔ جو شہروں میں رہنے اور اچھی سوسائٹی میں ملنے جلنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ناتراشیدہ اور ناصاف کردہ ہیرا تھا۔ جس پر اب تک میل چڑھا ہوا تھا۔ مگر اس دیہاتیت اور بھدے پن میں خلوص کی آب و تاب ماند نہ ہوئی تھی۔ وہ تانگا خود ہی ہنکاتا جاتا تھا۔ اور بھائی سے بہت ہی بے تکلفی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ اور موقع موقع سے بھائی کے آئی۔ سی۔ ایس۔ شہری اور رئیس ہونے پر طعن بھی کرتا جاتا تھا۔ غرض اس کی باتوں نے بچپن کے مانوس مناظر نے وطن کے سرسبز درختوں نے اور قصبہ کے ہرے بھرے کھیتوں نے وحید پر آہستہ آہستہ اثر کرنا شروع کیا وہ سب سے پہلے تو یہ بھولا کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس۔ ہے۔ پھر یہ بھولا کہ وہ بیگم سی تعلیم یافتہ رئیسہ کا شوہر ہے۔ پھر یہ بھولا کہ اس سے ہندوستان کے بڑے بڑے راجگان مہاراجگان سے ملاقات ہے۔ پھر یہ بھولا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ مہذب انسان ہے۔ وہ کیا کرتا جن حصوں سے وہ گذر رہا تھا ان کا ایک ایک ذرہ ایک ایک چپہ ایک ایک بوٹا اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہی زمین جس پر وہ کبھی ننگے پاؤں دوڑتا تھا۔ وہی کھیت جن میں اس نے اپنے ہاتھ سے مٹر اور چنا بویا تھا وہی درخت جن کی شاخوں پر جلد جلد چڑھ جانے کے مقابلہ میں وہ جیتا تھا۔ وہی چڑیاں جن کے بچے پکڑ لانے کے لئے وہ قصبہ بھر میں مشہور تھا۔ یہ ساری چیزیں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں اور اپنے اپنے طور پر دل کی گہرائیوں میں اپنے اپنے گرے پڑے گھروں کو کرید کرید کر اپنے بیٹھنے

کی جگہیں بنا رہی تھیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں سرسبز درخت لہلہا رہے تھے ہرے ہرے کھیت آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہے تھے اور سوندھی سوندھی مٹی کی بو مشام جان کو معطر کئے دیتی تھی کہ اتنے میں مکان کی کچی دیوار دکھائی دی، معلوم ہوا جیسے روح کی گردن میں پھندا ڈال کر کسی نے کھینچنا شروع کیا، چھوٹے بھائی نے بھی گھوڑے کو ایک چابک رسید کی۔ وہ پہلے ہی گھر دیکھتے ہی ہنہنا کے قدم بڑھا چکا تھا۔ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ وحید کا دم اس طرح پھول رہا تھا جیسے گھوڑے کی جگہ وہ خود اس دوڑ میں شریک ہو، عجب نہیں کہ اس کی نظر کے تار پر اس کی روح دوڑ رہی ہو۔

بابے گھر آیا سامنے بڑے میاں دکھائی دیئے۔ گھر پر سوائے کرتے۔ پائجامے اور سلیپر کے کچھ نہ پہنتے تھے۔ مگر آج خلاف معمول شیروانی بھی پہنے تھے۔ اور بوٹ بھی غالباً آئی۔ سی۔ ایس۔ اور تعلیم یافتہ بیگم ہو کی خاطر یہ زحمت انگیز کی تھی۔ وحید نے تانگے سے اتر کر تسلیم کی۔ انھوں نے آبدیدہ ہو کر گلے سے لگا لیا۔ باہری مکان میں قصبہ کے اور بھی عائد موجود تھے۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے بچپن میں اس کی گوشمالی کی تھی۔ اور ایسے بھی جو اس کے ساتھ بہت سی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ سب بڑی محبت سے ملے۔

بڑے میاں نے کہا "گھر میں اس وقت جانے کا موقع نہیں ہے۔ وہاں دلہن اتارنے کے لئے ساری برادری کی عورتیں جمع ہیں۔ آؤ تمھیں نئے مکان میں پہنچا دیں، اسے دیکھ لو اور نہا دھو کر کپڑے بدل ڈالو پھر باتیں ہوں" یہ کہہ کر خانہ باغ میں لے گئے۔ وہاں وحید کے حسب خواہش پختہ کھمبوں پر ایک بنگلہ نما چھپر ڈال دیا گیا تھا بیچ میں سبز کپڑے تان تان کے مختلف دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ یعنی اچھا خاصا صاحب کے لئے

ڈرائنگ روم، ڈریسنگ روم، سلیپنگ روم، ڈائننگ روم، اور کچھ مخصوص کمرے بیگم صاحبہ کے لئے تیار تھے پلنگ، کرسیاں فرش سب چیزیں سلیقے سے لگی تھیں۔

وحید حیرت سے اپنی والدہ کا منہ دیکھ کر بولا "یہ سب سامان کس نے اتنے سلیقے سے لگا ڈالا؟ انھوں نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جس دن سے تمھارا خط آیا ہے، بس یہ انھیں کاموں میں لگا رہا۔ پھر گاؤں بھر کے تمام جوان ساتھ تھے۔ انھی سبھوں نے مل کر یہ سب درست کیا ہے۔ نہ دن کو دن سمجھا ہے نہ رات کو رات!"

وحید نے بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ وہ بولا ہم دیہاتیوں کے ہاں صاحب، مع میم صاحبہ کے تشریف لا رہے تھے۔ پھر ہم اتنا بھی نہ کرتے! آئی۔ سی۔ ایس۔ جو لوگ ہوتے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں نازک ان کے دل و دماغ نازک ہوتے ہیں۔ اب اگر آپ ہمارے موٹے بھدے اور بدشکل پلنگ استعمال کرتے تو آپ کو تکلیف نہ ہوتی؟

وحید نے مسکرا کر کہا "ہوں"، تو تم سمجھتے ہو، ہم لوگ بالکل نازک ہوتے ہیں کیوں؟"

وہ بولا اور کیا؟ کیا آپ میرے ساتھ کھیت گوڑ سکتے ہیں، ہل چلا سکتے ہیں؟ پانچ منٹ میں بھاگ نکلے گا۔؟"

وحید نے کہا "اچھا ذرا میں نہا لوں تو تم کو بتاتا ہوں!!"

اس نے کہا "بہت اچھا آج ہی شام کو بھابی کے سامنے۔!"

بیگم کا اندر کیا رسپشن ہوا۔ کس کس طرح کی رسمیں کی گئیں بیبیوں نے کیا کیا فقرے کسے، کس کو پسند آئیں، خود ان پر کیا گذری اور ان کے ساتھ ماما دائیوں

نے کیا رائے قائم کی۔ یہ سب تمام باتیں بیان کرنا اس مختصر افسانہ میں ممکن نہیں اس کے لئے ایک پورے ناول کی ضرورت ہے۔ ہاں اتنا ظاہر ہیں آنکھیں بھی دیکھ سکتی تھیں کہ تمام وہ احکام جو ساس نے نافذ کئے وہ خوشی خوشی بجالائیں یہاں تک کہ بڑی بی نے اپنے دیہاتی لب ولہجہ میں خود کہا کہ "اللہ تمھیں مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے، تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ مجھے بڑے بڑے دسواس تھے، مگر مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ میں دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتی تو ایسی بہو نہ مل سکتی تھی! نندوں نے اس پر خوب خوب فقرے کسے، مگر بڑی نندوں نے چھوٹیوں کو ڈانٹا، اور انھیں اپنے ساتھ اٹھا کر زنانہ باغ والے مکان میں پہنچا آئیں۔ شام کو جب اعزا اور برادری کے لوگ جا چکے تو سارا گھر نئی بہو کے پاس سمٹ کر آگیا۔ بڑے میاں رونمائی کے لئے بلائے گئے اور بیوی کو ایک بھدیسل سونے کا زیور دے کر بہو کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ بڑی بی نے کہا وحید کو بھی بلالو، اب سب رسمیں ہوگئیں۔ اب خواہ مخواہ کی شرم بیکار ہے۔" وحید و حمید بھی آئے۔ بیگم نے اپنی ایک بوڑھی ماما کی طرف دیکھا۔ اس نے خوان پر خوان لگانا شروع کئے۔ کسی میں بڑی یادن کے لئے جوڑا نکلا۔ تو کسی میں نندوں کے لئے! تہذیب یہ کہ جس کا جوڑا ہوتا اس کے سامنے خوان لے کر خود بیگم جاتیں اور خوان رکھ کر اس طرح مودب کھڑی رہتیں جیسے معلوم ہوتا کوئی پجارن کسی دیوی کے سامنے بھینٹ چڑھا رہی ہے۔

میاں حمید پہلو بدل رہے تھے کہ عورتوں کو سب کچھ ملا مگر مجھ غریب کو کچھ بھی نہیں۔ کہ اتنے میں ایک اور خوان آیا، بیگم وہ لے کر اس کی طرف بڑھیں۔ اس نے جلدی سے بڑھ کر خوان سنبھال کر رکھا۔ خود خان پوش ہٹا کر دیکھا، خوان میں

کئی شیروانیوں اور قمیضوں کے کپڑے اور کئی پائجامے سلے ہوئے رکھے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کے رومال، موزے، عطر، سینٹ کنگھا، تیل اور ایک آئینہ اور کچھ روپے بھی رکھے تھے۔ حمید شرما گیا۔ بیگم نے آہستہ سے کہا "بھیا پاؤں اور سر کی ناپ نہ معلوم تھی۔ اس لئے ٹوپی اور جوتہ نہ خرید سکی۔ آپ اپنی پسند کا خرید لیجئے۔

وہ ان چیزوں کو لیتے ہوئے جھکا تو بڑے میاں نے کہا اخاہ آج آپ بھی شرما رہے ہیں۔ ارے بیوقوف تو تو چھوٹا ہے۔ بندگی کر اور سب جلدی سے سمیٹ!"

اس نے جلدی سے بیگم کو سلیم کی 'روپیہ اٹھانا چاہا' ماں نے کہا "اور بھائی کو تسلیم نہیں!"

وحید نے کہا "جی روپئے تو بیگم نے دیئے ہیں اور کپڑے بھی انھیں نے۔ میرا خدا شاہد ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انھوں نے یہ سب سامان کب اور کیوں کر درست کیا۔"

سب نے بیگم کو بڑی محبت سے دیکھا انھوں نے مسکرا کر سر جھکا لیا سب سے آخر میں دو بڑے بڑے خوان آئے، بیگم نے ایک ساس کے سامنے رکھا ایک سسرے کے، دونوں طرح طرح کے کپڑوں اور چیزوں سے پر تھے اور پھر لطف یہ کہ تمام چیزیں وہی جو ان کے خاص پسند کی تھیں۔

وحید متعجب ہو کر بول اٹھا۔ بھئی کمال کیا، یہ تمام سامان کر ڈالا اور میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

حمید نے کہا "جی بھلا صاحب کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا مطلب؟"

وحید اس پر جھپٹ پڑا۔ "تو آج صبح سے بہت تیزیاں کر رہا ہے۔ سمجھ لیا کہ میں

آئی۔ سی۔ ایس۔ کیا ہوں کہ بالکل موم کا بن گیا ہوں کھڑا تو رہ!"

وہ ہنستا ہوا یہ کہہ کر بھاگا "اچھا مجھے پکڑ ہی لیجئے۔ تو میں جانوں!"

دونوں بھائیوں میں دوڑ ہونے لگی۔ وہ بار بار جھکائیاں دے کر نکل جاتا مگر وحید برابر پیچھا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ حمید یہ سمجھ کر کہ اب گرفتار ہو جاؤں گا ایک املی کے درخت پر چڑھنے لگا۔ جب وحید اس کے نیچے آکر رک گیا تو وہ بولا "آیئے آئی۔ سی۔ ایس صاحب یہاں تشریف لائیے۔" وحید نے بھی جوتے کے فیتے کھول ڈالے، اور ننگے پاؤں ہو کر درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ املی کا درخت بہت بڑا تھا۔ حمید تو پہلے سب سے اونچی شاخ پر چڑھ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وحید اسی پر چلا آرہا ہے۔ تو جلدی سے وہ اس سے اچک کر دوسری پر ہو رہا۔ مگر تا بہ کے؟ وحید کی کمسنی کی مہارت کام آئی اس نے بالآخر حمید کو پکڑ ہی لیا اور وہیں سے کان پکڑے نیچے اتار لایا۔ حمید کے کھسیانے ہونے پر سارا گھر ہنستا رہا۔ مگر بیگم خاموش بیٹھی رہیں۔ وحید نے ان کی خاموشی سے ذرا سا اثر لیا۔ اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا تو ریشمی قمیص کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی اور پتلون کی ساری کریز" خاک میں مل گئی تھی۔ مگر اس وقت اس پر فضا اور ماحول کا پورا اثر ہو چکا تھا اس نے کچھ زیادہ پروا نہ کی۔ سامنے بہت سے بانس کٹے ہوئے پڑے تھے بھائی سے بولا "یہ یہاں اچھے نہیں معلوم ہوتے چلو دوسرے حصّہ میں پھینک آئیں۔ دیکھیں تو کتنی محنت کر سکتے ہو؟"

بڑے میاں نے کہا "نہیں بیٹا تم رہنے دو کل مزدور بلا کر ہٹا دیا جائے گا۔"

اس نے مسکرا کر کہا "نہیں ابّا جان یہ اپنے کو بڑا قوی سمجھنے لگا ہے آپ کے سامنے ہی آج فیصلہ ہو جائے گا!"

یہ کہہ کر حمید کے ساتھ بانسوں کے اٹھانے پر پل پڑا۔!

چشم زدن میں تقریباً ستّر بے چھلے بانس دونوں بھائیوں نے اٹھا کر دوسرے حصّہ میں منتقل کر دیئے۔ دونوں پسینے میں شرابور مٹی سے آئے ہوئے کرسیوں کے پاس آکر تھک کے بیٹھ گئے۔

بڑی بی نے پوچھا "حمید اب آئی۔ سی۔ ایس۔ کے متعلق کیا رائے ہے؟"

اس نے اپنے میلے ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ پوچھتے ہوئے کہا "میری دانست میں ان سے بجائے حکومت کرنے کے مزدوروں کا کام لینا چاہئے، یہ بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔"

سب لوگ ہنس ہی رہے تھے کہ بیگم ساس اور سسر کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وحید کو بیگم کے جاتے ہی خیال آیا، کہ اس نے اپنی دیہاتیت اور بربریت کا جس طرح مظاہرہ کیا ہے اس کے بعد اس کی کوئی وقعت بیگم کی نظروں میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے حد درجہ خجالت اور شرمندگی محسوس ہونے لگی اور باپ کے یہ کہنے پر کہ جاؤ میاں وحید نہا کر کپڑے بدل ڈالو، اب یہ تو بالکل درختوں اور بانسوں کی نذر ہو چکے۔" اس کی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

وہ گردن جھکائے اس حصّہ میں گیا جو حمام کرنے کے لئے مخصوص کر لیا گیا تھا اور اس نے نہا دھو کر جلدی جلدی کپڑے بدل ڈالے، پھر وہ شرمندہ اور منفعل اس کمرے میں گیا جو بیگم کے لئے مخصوص تھا۔ دیکھا تو وہ اپنے کمرے میں اس کی خاص پسند کی ساری پہنے کھڑکی کے سامنے کھڑی ہیں۔ وحید کو ان کے انداز سے محسوس ہوا کہ بیگم

اس کے افعال سے بے حد رنجیدہ ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "بیگم" انھوں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا وہ رک رک کر بولا "بیگم میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر... ..... مگر میں کیا کروں ..... اس ماحول اور اس فضا نے ..... مجھے انسانیت کا جامہ اتارنے پر مجبور کیا۔"

انھوں نے کہا "انسانیت نہ کہئے آئی۔ سی۔ ایس۔ کا جامہ کہئے۔"

وحید نے گھبرا کر ان کی صورت دیکھی وہ بولیں میں آج تک یہی سمجھتی تھی کہ میں نے ایک آئی۔ سی۔ ایس۔ سے ایک مہذب تعلیم یافتہ اور ایک شریف زادہ سے شادی کی ہے۔"

وحید بات کاٹ کر بولا "مگر آج معلوم ہو گیا کہ تم نے ایک دیہاتی گنوار جانور سے شادی کی ہے۔

بیگم کی آنکھیں عجیب طرح کے نور سے چمکنے لگیں وہ بولیں "نہیں میں نے جو کچھ سمجھ رکھا تھا ان سب سے کہیں بہتر چیز سے شادی کی ہے یعنی ..... یعنی ایک مرد سے!!!

سہیل عظیم آبادی

(تبصرہ)

پریم چند کے بعد جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے ان میں سہیل عظیم آبادی کا نام نمایاں ہے۔ وہ پریم چند سے تو خیر متاثر تھے ہی۔ لیکن رہی سہی کمی ترقی پسند تحریک نے پوری کر دی۔

سہیل عظیم آبادی ۱۵ جولائی ۱۹۱۰ء کو بہار کے ایک گاؤں بھدول میں پیدا ہوئے۔ اس گاؤں پر ہندو مہنتوں اور مسلمان زمینداروں اور کاشتکاروں کا تسلط تھا۔ ماں باپ نے مجیب الرحمٰن نام رکھا لیکن دنیائے ادب میں سہیل عظیم آبادی کے نام سے شہرت پائی۔

سہیل صاحب کے آباد اجداد اچھی خاصی خود کاشت آراضی کے مالک تھے۔ ان کی گنتی گاؤں کے بڑے کاشت کاروں میں ہوتی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا اور گھر کے کاشتکارانہ ماحول نے سہیل صاحب کی ذہنی تعمیر میں بہت اہم رول ادا کیا۔ بالخصوص کسانوں کے مسائل سے دلچسپی کا جذبہ اسی ماحول کی دین ہے۔ ان کی شخصیت کے تحفظ کا خیر اسی چھوٹے سے

گاؤں میں تیار ہوا جس نے انھیں غریب کسانوں، ہریجنوں، کم مایہ دکانداروں اور کھیت مزدوروں کا ہمدرد بنا دیا۔

سہیل عظیم آبادی نے پریم چند کی روایت کو اور آگے بڑھایا۔ وہ آدرش رکھتے تھے لیکن اپنے افسانوں میں اپنے آدرشوں کا براہِ راست پرچار نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے کسانوں کے مسائل کو دیکھا اور سمجھا۔ کسانوں کی تحریک سے متاثر ہوئے لیکن انھوں نے اپنے افسانے کو حقیقتوں کی آنچ میں تپایا۔ اس پر کوئی فریب کا ملمع نہیں چڑھایا۔

تمر رئیس لکھتے ہیں:۔ "پریم چند اور ان کے فن سے محبت اور وابستگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سہیل صاحب کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں تھی یا یہ کہ وہ پریم چند کے مقلد ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے پریم چند کی واقعیت، ان کی انسان دوستی اور ان کے فن کی سادگی سے ابتدائی دور میں گہرے اثرات قبول کئے لیکن آہستہ آہستہ ان سے آزاد ہو کر انھوں نے اپنے فن کی راہوں کا تعین کیا۔ اس سفر میں انھوں نے پریم چند کی افسانہ نگاری کے بہت سے پہلوؤں کا اعتراف بھی کیا۔"

سہیل عظیم آبادی گاؤں کے سیدھے سادے ماحول اور کرداروں کو نہایت چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے بہترین افسانوں میں گاؤں کی فضا اور اس کا ماحول جاری و ساری نظر آتا ہے۔ "جینے کے لئے" کا ہیرو گوبر دھن اسی ماحول کا پروردہ ہے۔ اس افسانے کا ہیرو پریم چند کے ہیرو "ہوری" سے مختلف ہے۔ یہ فرق زمانے کا فرق ہے۔ یہاں جبر ایسی مجبوری ہے جس کے خلاف محض خاموش احتجاج ہی کافی نہیں ہے۔ کیوں کہ ظلم کو خاموشی سے برداشت کرنا ظلم کا ساتھ دینا ہے۔ اس مختصر افسانے میں سہیل عظیم آبادی نے ایک جدوجہد کا خاکہ پیش کیا ہے، جو ایک بڑی تحریک کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ انھوں نے ایک کش مکش کا پورا نقشہ پیش کیا ہے، گوبر دھن کہتا ہے: "رام لعل بھائی جینے کے لئے مرنا بھی ہوگا" کیونکہ

زندگی میں صرف دان پن سے کام نہیں چلتا۔ زندہ رہنے کے لئے، اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے لڑنا بھی پڑتا ہے۔ سہیل، یہاں حقیقت کو آدرش پر قربان نہیں کرتے۔ اس لئے نہیں کہ انھیں آدرش عزیز نہیں ہے بلکہ وہ آدرش کو اہم نہیں سمجھتے۔

سہیل عظیم آبادی نے تقریباً ڈیڑھ سو کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے ناولٹ بھی لکھے لیکن ان کو شہرت ان کے افسانوں کے ذریعہ ہی ملی۔

۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو الہ آباد میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا

○

جینے کے لئے

رات اندھیری تھی اور آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی پروائی بہہ رہی تھی۔ گوبردھن مکان سے باہر کھلے میدان میں پلنگڑی پر پڑا آسمان کو تک رہا تھا اور ذرا فکرمند تھا کہ جیٹھ کا مہینہ ختم ہو رہا ہے اور آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہیں آتا مگر اس کو یقین تھا کہ اساڑھ کے آتے ہی موسم درست ہو جائے گا اور پانی برسے گا۔ چیت اور بیساکھ میں خوب لُو چلی تھی اور خوب لُو چلنا اچھی برسات ہونے کی نشانی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس سال فصل سدھر گئی تو چھوٹے لڑکے کی شادی کر کے اطمینان کا سانس لے گا۔ پھر اس کے سر پر کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی۔

وہ اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ اسے روشنی نظر آئی اور کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ رہا۔ کوئی آدمی ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے ہاتھ میں لالٹین لیے اس کی طرف آ رہا تھا، اور جب وہ نزدیک آگیا تو اس نے پہچان لیا کہ وہ آنے والا رام لال ہے، گاؤں کے بڑے زمیندار بابو گردھاری سنگھ کا خاص پیادہ۔ رام لال کو پہچانتے ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ آدھی رات گئے رام لال کا آنا اچھا شگون نہیں ہو سکتا۔ رام لال کا کسی رعیت کے گھر پر جانا مصیبت کے آنے سے کم

نہ تھا، اور وہ ہر بات کے لئے تیار ہو بیٹھا۔ جیسے ہی رام لال سامنے آیا گوبردھن نے اٹھ کر سلام کیا اور خوشامدانہ انداز میں بولا۔

"کھیر تو ہے رام لال بھائی! ای گھڑی آئے ہو کیا بات ہے؟"

رام لال ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لیے کھڑا تھا لیکن اس وقت اس میں پہلی سی اکڑ اور اینٹھن نہیں تھی بلکہ وہ ڈھیلا ڈھالا سا تھا اور پوچھنے پر کچھ بولا بھی نہیں۔ رام لال ہمیشہ اینٹھ کر بولنے کا عادی تھا اور کسی کی کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف پڑی تو پھٹ سے گالی دے دینا یا مار کر پٹرا کر دینے کی دھمکی دینا اس کی معمولی بات تھی۔

رام لال نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو گوبردھن نے سمجھا کہ کوئی سخت بات ہے اور رام لال بھی خفا ہے تو رام لال کو خوش کرنے کے لئے اس نے کہا۔

"بیٹھو رام لال بھائی، چلم لاتا ہوں، دو دم لگا لو۔"

رام لال نے کہا: "نہیں گوبردھن سمے نہیں ہے۔ سارا گاؤں گھومنا ہے، سب کو خبر دینا ہے، صبح سویرے بنگلے پر بلاوا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ گوبردھن نے محسوس کیا کہ اس کے قدم ڈھیلے پڑ رہے ہیں اور وہ بے جان سا معلوم ہوتا ہے۔ گوبردھن پلنگڑی پر بیٹھا رام لال کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا بات ہے جو رام لال آج اتنا بدلا ہوا ہے۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اتنا اس نے ضرور سمجھا کہ بات کوئی گمبھیر معلوم ہوتی ہے پھر اس نے دیکھا کہ رام لال یکایک مڑا اور اس کے پاس آگیا اور آتے ہی بولا۔

"گوبردھن ذرا لاؤ چلم، دو دم لگالیں۔" اور پاس ہی پڑی ہوئی لکڑی پر بیٹھ

گیا۔ گوبردھن جلدی سے گھر کے اندر گیا اور چلم بھر کے لے آیا۔ ہوا چل رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں چلم تیار ہو گئی اور رام لال نے دو دم لگایا اور چلم گوبردھن کو دیتے ہوئے بولا۔

"ہم کو ٹھیک معلوم نہیں گوبردھن، لیکن ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے کسانوں پر کوئی مصیبت آنے والی ہے"۔

گوبردھن نے پوچھا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

رام لال نے کہا۔

"دو دن سے بڑے سرکار، چھوٹے سرکار، راجہ بابو، لیلا بابو، رام چرتر بابو، اور سب چھوٹے بڑے زمیندار بیٹھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے اور اس طرح کہ کوئی دوسرا نہ سننے پائے۔

گوبردھن نے ذرا اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

نہیں رام لال بھائی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ زمینداری اٹھ رہی ہے۔ سب بچار کرتے ہوں گے کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد کیا کریں گے؟"

رام لال بولا۔

"بھیا ہم ان سب کو جانتے ہیں۔ تم کیا جانو—"

رام لال چلا گیا لیکن اس کے منہ سے ایسی باتیں سن کر گوبردھن کی ہمت ٹوٹ گئی۔ ٹھیک ہی بات تھی۔ رام لال سے زیادہ زمینداروں کو اور کون جانتا تھا۔ اس کی ساری زندگی زمیندار کی خدمت گزاری میں کٹی تھی اور دو ہی برس پہلے کسی بات

پر رام لال نے جھنٹو دھوبی کو دو لاٹھی مارا تھا اور جھنٹو نے اس پر مقدمہ چلایا تھا تو بڑے سرکار نے چار ہزار روپے خرچ کر دیا تھا اور رام لال کو صاف بچا لائے تھے۔ اور جھنٹو دھوبی کو معلوم ہو گیا تھا کہ کلکتے میں رہ کر کچھ روپیہ کما لینا آسان ہے لیکن گاؤں کے زمیندار اور زمیندار کے آدمی سے لڑائی مول لینا آسان نہیں اور مقدمہ ختم ہونے کے بعد بڑے سرکار نے گاؤں کے پچیسیوں آدمی کے سامنے کہا تھا کہ دو چار ہزار تو کیا اگر وقت پڑ جائے تو رام لال کے لئے دو چار لاکھ خرچ کرنے سے نہیں بھاگ سکتے۔ اب اسی کا نتیجہ تھا کہ رام لال اتنا سر چڑھ گیا تھا کہ کسی کو گالی دے دینا یا مار دینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔

رام لال کے چلے جانے کے بعد بھی گوبردھن کو نیند نہ آئی۔ اس کی آنکھ جھپکتی تھی اور کھل جاتی تھی۔ دل کے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرتا تھا جو اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور بار بار سوچتا تھا کہ آخر بنگلے پر کس لئے بلاوا ہے۔ رام لال اتنا اداس کیوں ہے؟ جن بڑے سرکار کے نام پر وہ ہر وقت مرنے کو تیار تھا ان سے بھی اس قدر مایوس کیوں ہے؟

صبح ہوئی تو وہ زمیندار کے بنگلے پر پہنچا۔ وہاں احاطے میں بہت سے لوگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ مزدوروں کے ساتھ ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی۔ ہر طرف ایک ہی سوال دہرایا جا رہا تھا۔ آخر گاؤں بھر کی ساری رعایا کو کیوں بلایا گیا ہے؟ اگر سب کو الگ الگ بلایا جاتا تو مطلب یہ ہوتا کہ الگ الگ لوگوں سے الگ کام ہے سب کو ایک ساتھ بلانے کا مطلب تو ایک ہی ہو سکتا ہے کہ سب کو ایک ہی حکم سنانا ہے۔

جب گوبردھن بنگلے پر پہنچا تھا تو اس وقت بڑے سرکار نہ تھے۔ صرف ان کے

منیجر کرپال سنگھ اور پٹواری بشن پرساد بیٹھے تھے، بڑے سرکار گھر کے اندر سے نہیں آئے تھے۔ وہ صبح کی پوجا کرنے کے بعد ناشتہ کر رہے تھے اور باہر سارے لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر کچھ دیر کے بعد بڑے سرکار گھر کے اندر سے بنگلے پر آئے۔ ان کے آتے ہی سارے لوگ سمٹ کر بنگلے کے قریب آگئے اور بڑے سرکار ذرا نزدیک آئے۔ جب لوگ ان کی طرف مخاطب ہو گئے تو انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"تم لوگوں کو بلایا ہے کہ ایک بات کہوں۔ بات ایسی ہے کہ جس کے کہتے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مگر کوئی چارہ بھی نہیں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ جو رعیت بھی میری جتنی زمین جوتتا ہے اسے اب اس کے پاس نہیں جانا ہوگا۔ میں سب سے اپنی زمین واپس لیتا ہوں۔"

بڑے سرکار کی زبان سے یہ اعلان سننا تھا کہ ایک کہرام سا مچ گیا۔ زمین واپس لے لیں گے تو پھر کسی رعیت کے پاس کیا رہ جائے گا۔ گاؤں میں کسی کسان کے پاس اپنی اتنی زمین نہیں تھی کہ اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پال سکے۔ سب کے سب زمیندار کی زمین جوت کر گزارہ کرتے تھے۔ ہر طرف سے دہائی پڑنے لگی۔ "سرکار ہم سب مر جائیں گے۔" بڑے سرکار نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ گھر کے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر تک تو لوگ وہاں منڈلاتے رہے۔ آخر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ راستے میں انھیں معلوم ہوا کہ گاؤں کے دوسرے چھوٹے چھوٹے زمینداروں نے بھی اسی قسم کا اعلان کر دیا ہے۔

زمینداروں کے اس نئے اعلان سے راگھو پور کے سارے کسان بدحواس تھے

کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سب نے باری باری جا کر اپنے مالکوں کی خوشامدیں کیں لیکن سب کو یہی جواب ملا کہ فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ اگر زمیندار کسانوں کو زمین دے دیں گے تو خود کیا کھائیں گے۔ زمینداریاں ختم ہو جانے کے بعد ان کے پاس کیا رہ جائے گا۔ راگھو پور میں کوئی پچیس گھر راجپوت تھے اور وہی سب چھوٹے بڑے زمیندار تھے اور دوسرے لوگ کسان اور رعایا۔ جن کی مجموعی آبادی چار سو گھر سے زیادہ نہ تھی۔

بڑے بوڑھے تو پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے، کچھ جوان اور ادھیڑ آدمی محنت مزدوری کرنے شہر چلے بھی گئے تھے اور جو لوگ گاؤں میں تھے وہ قسمت آزمانے کو روز زمیندار کی خوشامدیں کرنے جاتے یا کہیں بیٹھ کر آپس میں قسمت کے گلے کرتے یا مشورے کرتے۔

زمینداروں نے کسانوں سے زمینیں تو لے لیں لیکن ان کے سامنے بھی ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی کے پاس ساری زمین میں کھیتی کرنے کا سامان نہ تھا۔ بڑے سرکار کے پاس نہ تو آدمیوں کی کمی تھی اور نہ سامان کی، لیکن سب کے سب ان کی طرح مضبوط تو تھے نہیں اور جب کھیتوں میں ہل چلانے کا وقت آیا تو ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس بیچ میں کسانوں نے بھی مشورہ کر کے آپس میں فیصلہ کیا کہ کوئی زمینداروں کے کھیت میں کام نہیں کرے گا یا اگر کرے گا تو پھر پانچ سیر روز مزدوری لے گا۔

زمینداروں نے جب یہ بات سنی تو ان کو بہت غصہ آیا اور وہ سوچنے لگے کہ کس طرح اس حالت کا مقابلہ کیا جائے۔ بعض نوجوان کسانوں میں زیادہ جوش تھا اور وہ سوچ

رہے تھے کہ زمینوں پر زبردستی قبضہ کرلیں اور زبردستی بھی کیا۔ جن زمینوں کو وہ جوتتے آرہے ہیں وہ تو قانون کے مطابق ان کی ہو چکی تھیں اور اب جو زمیندار نے ان سے زمین لے لی تھی تو اس کی زبردستی تھی لیکن گاؤں کے بڑے بوڑھے منع کرتے تھے اور وہ سب کے سب دبے ہوئے تھے۔

اس کھینچ تان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت آگیا اور زمینیں بنجر پڑی رہیں۔ زمینداروں کے پاس پہلے سے کھیتوں میں جو کام کرنے والے تھے ان سے بھی کھیت لے لئے گئے تھے اور اس کی وجہ سے وہ بھی زیادہ مزدوری مانگنے لگے تھے۔ بعضوں کو زمینداروں نے مار پیٹ کی تھی اور وہ بھاگ گئے تھے اور گاؤں کا عجیب حال ہو رہا تھا۔ ایک کھیت میں ہل چلایا گیا ہے تو پچیس یوں ہی پڑے ہیں۔ زمیندار نہ کسانوں کو زمین واپس دینے پر تیار تھے اور نہ زیادہ مزدوری دینے پر، اور جب کوئی کسان ادھر سے گزرتا اور اس زمین کا یہ حال دیکھتا جس میں کبھی اس کی کھیتی لہلہاتی تھی، تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

گوبر دھن نے یہ حال دیکھا تو پھر سب سے مشورے کرنے لگا۔ اس کے پاس زمیندار کی بیس بیگھہ زمین تھی۔ اس کے لے لئے جانے کے بعد صرف تین بیگھہ اپنی زمین رہ گئی تھی اور اس سے اس کا اور خاندان بھر کا گذارہ ناممکن تھا۔ پھر جب وہ زمین کو دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ لیکن کوئی بھی اسے کوئی مناسب مشورہ نہیں دے سکا تو ایک دن اس نے اپنے چند آدمیوں کو کہہ دیا اور دوسرے دن صبح سویرے اس زمین پر ہل چلا دیا جس کو وہ برسوں سے جوتتا آیا تھا۔

جیسے ہی کھیت میں ہل چلتا نظر آیا اک شور ہوا اور زمیندار کے تین آدمی

اسے روکنے آئے لیکن گوبر دھن نے ہل کو باہر لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسے روکنے کے لئے آنے والوں میں رام لال بھی تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں اس سے اونچی لاٹھی بھی تھی اور اس نے آکر منع بھی کیا لیکن اس کی آواز میں پہلا سا زور نہیں تھا اور نہ عادت کے مطابق اس نے آتے ہی لاٹھی چلائی۔ گوبر دھن نے کہا۔

"جاؤ رام لال بھائی اپنے گھر۔ اب کیا دھرا ہے۔ بچے بھوکے مریں گے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ ہم کو روک کر تمھیں کیا مل جائے گا۔ تم چاہتے ہو کہ ہمارے بچے مر جائیں۔۔۔"

لیکن رام لال نے زبردستی ہل سے بیل کھول کر ہانک دیئے۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی آئے تھے وہ بیلوں کو لے کر بنگلہ پر جانے لگے تو گوبر دھن کے بیٹے جیتو نے انھیں راہ میں گھیر لیا اور بولا۔

"تم بیل نہیں لے جا سکتے۔" اور بیلوں کو پکڑ لیا۔ زمیندار کے بیٹے نے اس پر لاٹھی چلا دی۔ پھر کیا تھا۔ دو چار کسان اور آگئے اور دونوں طرف سے لاٹھی چلنے لگی۔ زمیندار کے آدمی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد مشورہ ہوا کہ سارے کسان زمینداروں کی وہ زمین جوت ڈالیں جو پہلے وہ جوتتے تھے اور دیکھا دیکھی چاروں طرف سے ہل چلنے لگے۔ زمینداروں کے لئے یہ کھلا چیلنج تھا اور بھاگ کھڑے ہونے کا مطلب ہمیشہ کے لئے بے دخلی کو قبول کر لینا تھا، مگر مصیبت یہ تھی کہ زمینداروں کے پاس آدمی کم تھے اور جو تھے وہ بھی بھروسے کے لائق نہیں کیوں کہ انھیں کے بھائی بھتیجے کھیتوں پر ہل چلانے جا رہے تھے۔

آخر زمیندار خود اپنی اپنی بندوقیں لے کر گھروں سے نکل آئے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جو بھی کسی کھیت پر ہل چلائے گا وہ گولیوں کا شکار ہوگا۔

لیکن کسانوں میں جوش بہت زیادہ تھا۔ بندوقوں سے کوئی بھی نہ ڈرا اور کھیتوں پر ہل چلا دیئے گئے۔ اور ہلوں کا چلنا تھا کہ گولیاں بھی چل پڑیں اور دیکھتے دیکھتے کھیتوں میں بیسیوں لاشیں گر گئیں۔

دوسرے دن گاؤں میں ہر طرف لال پگڑی والے سپاہی نظر آتے تھے اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ کھیتوں پر دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تھا اور کھیت بنجر کے بنجر پڑے تھے۔

گوبر دھن اور رام لال دونوں حوالات میں بند تھے۔ رام لال نے کہا۔

"گوبر دھن تم نے اچھا نہیں کیا۔ اتنا بڑا جھگڑا کھڑا کر دیا۔"

گوبر دھن نے گھمنڈ سے سر اٹھا کر کہا۔

"رام لال بھائی ایسا نہیں ہو سکتا کہ گائے بھوکی مرے اور سور کھا کر کھائے۔"

رام لال نے کہا۔

"مگر دیکھو کتنوں کی جان گئی۔"

گوبر دھن نے کہا۔

"رام لال بھائی جینے کے لئے مرنا بھی ہوگا۔"

اپندر ناتھ اشک

(تبصرہ)

اپندر ناتھ اشک اردو کے سب سے بزرگ افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانوی زندگی کا آغاز پریم چند کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "نورتن" کے نام سے شایع ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ "عورت کی فطرت" ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا۔ ان کے ابتدائی افسانے زیادہ تر معاشرتی ہیں اور ان کے طرز پر جا بجا پریم چند کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

اشک کو اردو داں طبقے نے نئے افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کتاب "ڈاچی" کے ذریعہ پہچانا ہے۔ "ڈاچی" کے ان افسانوں کو چھوڑ کر جس کا پس منظر تاریخی اور نفس مضمون اور مرکزی خیال اخلاقی اور اصلاحی ہے، اکثر افسانوں کا ماحول سیاسی ہے۔ یہاں ہندوستان کی خارجی زندگی کے پہلوؤں کی رنگا رنگ تصویریں ملتی ہیں لیکن اس میں ایک گہرا اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر چھپا ہوا ہے۔ سیاسی اور اصلاحی افسانوں سے قطع نظر ان کے رومانی افسانے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ "ڈاچی" کے بعد ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شایع

ہو چکے ہیں۔ "کونپل"، "قفس"، "ناسور"۔۔۔ اشک کے یہاں ہندوستان کے متوسط طبقے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔۔۔ ان کے افسانوں میں خلوص اور سچائی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اسے بلا تکلف بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کی صداقتوں سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اشک کے افسانوں میں نقلی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ وہ نفسیات اور ذہنی کشمکش کا اظہار بڑی سادگی سے کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مختلف طبقات کی کشمکش بھی ہوتی ہے اور مادی زندگی کے واقعات ۔۔۔ اور وہ ان سب کو کرداروں کے ذریعے بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

اردو کے کسی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کے ارتقا کی اتنی منزلیں طے نہیں کیں جتنی اشک نے۔ ان کے افسانے فن کی اس منزل سے شروع ہوتے ہیں جہاں کوئی فن تھا ہی نہیں۔ جہاں افسانہ محض دلچسپی کے لئے لکھا جاتا تھا اور کوئی نہ کوئی اخلاقی درس ہوتا تھا۔ اور ان کے افسانے کے آخری دور میں ایک خاص قسم کا نیا پن ہے جو مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے بعد کے افسانوں میں بھی عمل اور فکر کا دائرہ پہلے جیسا ہے۔ لیکن افسانوں کا ماحول اور ملوی فضا پہلے جیسی ہونے کے باوجود نظر کی گہرائی اور وسعت کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اس لئے اب جزئیات کی طرف بھی زیادہ زور ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تفصیلات میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں کا قاری ذرا بھی نہیں اکتاتا۔ ان کے یہاں اشارے بھی ملتے ہیں اور ان اشاروں میں اب معنویت اور دور رسی ہے۔ اشارے اب پلاٹ کے تسلسل میں مدد دیتے ہیں، کہانی کے بنیادی خیال میں تاثیر پیدا کرتے ہیں اور کردار نگاری میں پختگی پیدا کرتے ہیں۔۔۔ ان کے موضوعات میں غیر معمولی تنوع ہے۔

اپندر ناتھ اشک ایک زمانے سے پابندی سے ہندی میں لکھ رہے ہیں اور انھوں نے ہندی افسانوی ادب کو متاثر کیا ہے۔

اردو میں اپندر ناتھ اشک کا نام کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور ہندی میں آگیے اور یشپال کے ساتھ۔ افسانوی ادب کا مطالعہ بغیر اشک کے مکمل نہیں ہے۔

اشک نے تقریباً دو سو کہانیاں لکھی ہیں اور جو ان کے مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔

اپندر ناتھ اشک نے صحیح معنوں میں پریم چند کے دور میں قدم رکھا اور اس کے بعد پریم چند کی روایات کو پروان چڑھایا۔

○

کالے صاحب

ڈی ایم کی کوٹھی سے باہر نکل کر شری واستو نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ آٹھ بجے تھے۔ اس کے پاس پورا ایک گھنٹہ تھا۔ چپراسی سے معلوم ہوا تھا کہ صاحب ۹ بجے واپس آئیں گے تو کیوں نہ وہ گیان کو الٰہ آباد میں اپنی آمد کی خوشخبری سنا آئے۔ ایک پنتھ دو کاج پر ہمیشہ اس کا اعتقاد رہا ہے۔ بلکہ اگر کسی پنتھ میں دو کے بدلے چار کاج ہوں، تو وہ ان سب کو ایک ساتھ نمٹانے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چھ سات سال قبل تیس چالیس روپیہ ماہوار کے کلرک سے ترقی کر کے وہ اس قلیل عرصہ میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے بعد اسی چستی و چالاکی کی بدولت وہ چھوٹے، غیر اہم اضلاع کو پھاندتا ہوا الٰہ آباد جیسے اہم اور بڑے ضلعے میں تعینات ہو گیا تھا۔ آج ہی صبح اس نے الٰہ آباد میں قدم رکھا تھا اور آج ہی وہ اپنے افسر کے یہاں حاضری دینے جا پہنچا تھا لیکن ڈی ایم لکھنؤ سے دورہ کے سلسلے میں آنے والے کسی منسٹر کی خدمت میں حاضری دینے گئے ہوئے تھے اس لئے شری واستو کے پاس ایک گھنٹہ خالی تھا۔ گیان اس کا بچپن کا دوست تھا۔ ایلن گنج میں رہتا تھا اور یونیورسٹی میں لکچرار تھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ ابھی گھر

پر ہی ہوگا۔ شری واستو نے اس فاضل وقت میں اسی کے ہاں ہو آنے کا فیصلہ کیا۔ کچہری کے پاس سے گذر کر وہ سڑک پر آ کھڑا ہوا۔ ایک روز اسی کچہری کا وہ بڑا حاکم بنے گا۔ یہ خیال آتے ہی فخر سے اس کی ایڑیاں قدرے اٹھ گئیں اور اس کے ہاتھ بش شرٹ کے اکڑے ہوئے کالروں پر ہوتے ہوئے دامن پر آ کر رک گئے اور بٹنوں پر ایک دو بار زور دیتے ہوئے اس نے آگے پیچھے سے بش شرٹ کو درست کیا۔ تبھی اس کی نظر سامنے بارہ دری کے قریب دو رکشا والوں پر پڑی جو غالباً اسی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ "رکشیا" اس نے حاجی انداز سے گلے میں الفاظ کو قدرے اینٹھتے ہوئے آواز دی۔

"جی حضور!"

اور دونوں رکشا اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"کیوں بھائی گھنٹے کے حساب سے چلو گے؟"

"کہاں جائیں گے؟" پہلے رکشا والے نے پوچھا۔

"کہیں بھی جائیں!"

"کیا گھنٹہ لے گا؟"

"جو بھی ریٹ ہوگا!"

"روپیہ گھنٹہ لیں گے!"

"دس آنے ملیں گے!"

"اجی آیئے حضور۔ آپ اِدھر آیئے!" دوسرے رکشا والے نے ہانک لگائی۔

"ہاں ہاں، تم لے آؤ!"

اور دوسری رکشا کے برابر آتے ہی شریواستو اچک کر اس پر بیٹھ گیا بش شرٹ کو دونوں طرف سے ذرا کھینچ کر اس نے درست کیا اور پتلون کو قدرے اوپر اٹھا لیا تاکہ اس کی کریز خراب نہ ہو جائے۔ وہ پیچھے کی طرف بیٹھ لگا کر آرام سے نہیں بیٹھا اُسے خوف تھا کہ بش شرٹ مسل نہ جائے۔ ڈی ایم سے ملنے تک وہ اسی طرح خوش پوش اپ ٹو ڈیٹ بنا رہنا چاہتا تھا۔ رکشا پر وہ اس طرح اکڑا بیٹھا تھا گویا ڈی ایم سے مصافحہ کرکے ابھی کرسی پر بیٹھا ہو۔ سیدھا، اکڑا ہوا اور چاق چوبند۔

رکشا والا خاکی سوٹ پہنے تھا۔ سوٹ بہت میلا بھی نہ تھا۔ شکل سے وہ بھی عام رکشا والا معلوم ہوتا تھا۔ الہ آباد کے رکشے والوں میں دیہاتیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ فصل کا موسم نہ ہو اور کام سے فرصت ہو تو قرب و جوار کے دیہاتی اپنے لحیم شحیم جسم پر کھادی کی بنڈی اور کمر میں انگوچھا باندھے پوٹلی میں ایک وقت کا راشن لئے الہ آباد کی جانب چل پڑتے ہیں۔ شام کو پہنچتے ہیں، رات کے لئے رکشا لیتے ہیں اور سواری سے کرایہ لے کر ہی دوسرے وقت کا ستو خریدتے ہیں۔ انہی رکشا والے دیہاتیوں کی سہولت کے لئے بہت سے پنواڑیوں نے پان، بیڑی، سگرٹ کے ساتھ ستو کے تھال بھی سجا رکھے ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے اہرام میں ہری مرچیں گھُسی ہوئی عجیب بہار دیتی ہیں۔ یہ دیہاتی رکشا والے رکشا چلاتے چلاتے جب ذرا وقت پاتے ہیں تو سیر آدھ سیر ستو لے کر دوکاندار ہی کی تھالی میں گوندھ کر لوندا سا بنا لیتے ہیں اور ہاتھ پر رکھ کر نمک مرچ کی مدد سے حلق سے اتار کر قریب کے کسی نل سے دو گھونٹ پانی پی لیتے ہیں۔ کہتے ہیں گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس گیدڑ اور ان دیہاتیوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دن دن

بھر اور اکثر دن اور رات بھر رکشا چلا کر جہاں وہ سال سال بھر کا لگان کما کر لے جاتے ہیں وہاں پھیپھڑوں کو بھی دق کے لئے تیار کر لے جاتے ہیں۔

دوسرے رکشا والے الہ آباد ہی کے ایسے شہری مزدور ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد بیکار ہو گئے ہیں۔ رکشا چلاتے چلاتے ان کی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ سل ان کی آنکھوں میں جھانکتا ہے پھر بھی وہ گرانی کے اس زمانے میں بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے رکشا کھینچنے پر مجبور ہیں۔

شریواستو الہ آباد ہی کا رہنے والا تھا۔ وہ ان دونوں طرح کے رکشا والوں سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن اس کا یہ رکشا والا اسے ان دونوں سے جدا نظر آیا۔ ادھر رکشا والوں کی ایک تیسری قسم بھی نظر آنے لگی ہے۔ رونالڈ کولمن کی طرح باریک سی مونچھیں رکھے۔ فوجی پینٹ یا بش شرٹ یا صرف ٹوپی پہنے، جنگ سے فرصت پائے، بیکار فوجی رکشا چلانے لگے ہیں۔ رکشا چلاتے وقت ان کے سر کا ترچھا پن، سائیکل کی گدی پر بیٹھے ہوئے ان کی کمر کی اکڑ اور پیڈل گھماتے ہوئے باہر کی طرف گھٹنوں کا پھیلاؤ پہلی ہی نظر میں ان کے فوجی ہونے کا پتہ دے دیتا ہے۔ ہونٹوں کے داہنے یا بائیں گوشے میں بیڑی دبائے تیسری جنگ عظیم کے خواب دیکھتے، مصر، ایران، اٹلی، جرمنی وہاں کی آزاد فضا اور گوری گوری لڑکیوں کے تصور میں غرق وہ دندناتے ہوئے رکشا چلائے جاتے ہیں۔ آزادی نے انھیں گڑگڑانا بھلا کر احساس خودی سے سر اٹھانا سکھا دیا ہے۔ چونکہ بیشتر نیم تعلیم یافتہ ہیں اس لئے خودی کی حدود کہاں اکھڑپن سے جا ملتی ہیں، یہ نہیں جانتے۔ مول بھاؤ زیادہ نہیں کرتے اور سواری کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا وہ مال غنیمت میں پائے ہوئے دشمن کے شہری ہوں۔

یہ رکشا والا اگرچہ فوجی وردی پہنے ہوئے تھا لیکن اس میں نہ وہ فوجیوں کی سی اکڑ تھی نہ اس کے چہرے پر دوسرے فوجیوں کی مانند خشک آٹے کا تناؤ تھا۔ اس کے برعکس وہاں گندھی ہوئی لوئی کی سی نرمی اور لچک تھی۔

"کیوں جی تم فوج میں کام کرتے تھے؟" شری واستو نے اکڑے بیٹھے بیٹھے اکتا کر جسم کو قدرے ڈھیلا چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

رکشا والے نے رکشا چلاتے چلاتے ذرا پیچھے کی طرف دیکھا۔

"نہیں صاحب۔ فوج میں ہم کیا کام کرتے!" یہ کہتے کہتے اس کے لبوں پر طنز آمیز پُر حقارت تبسم دوڑ گیا جس میں ہلکے درد کی جھلک بھی شری واستو کی آنکھوں سے چھپی نہ رہی۔ وہ تبسم گویا کہہ رہا تھا کہ فوج کی ملازمت جیسا گرا ہوا کام ہم کیوں کرتے۔

"تو کیا رکشے چلاتے؟" شری واستو کا مطلب تھا کہ کیا چار چھ رکشے رکھ کر ان کی آمدنی سے گذر کرتے ہو۔

رکشا والا ہنسا۔ "اجی صاحب کہاں۔ یہاں تو یہ رکشا بھی اپنا نہیں۔ کرائے پر لے کر چلاتے ہیں۔"

شری واستو کو اس کی آواز میں شرافت کا کافی عنصر دکھائی دیا۔ اسے اس شریف رکشا والے کے ساتھ کچھ ہمدردی ہوئی۔ "تو ایسا جان لیوا کام کیوں کرتے ہو؟" اس نے کہا۔ "رکشا چلانے سے تو پھیپھڑوں پر بڑا زور پڑتا ہے۔ دن رات ہل اور بھاڑا چلانے والے دیہاتی تو اسے کھینچ سکتے ہیں۔ تمہارے جیسے شہریوں کے بس کا یہ کام نہیں۔"

"جی، ہم کیا اپنی خوشی سے چلاتے ہیں۔ بیوی ہے۔ تین چار بچے ہیں۔ ماں ہے۔ دو بیوہ بہنیں ہیں۔ اتنے بڑے کنبے کا بار اکیلے ہمیں پر ہے۔"

"تم کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ہم کو دوسرا کوئی کام آتا نہیں صاحب۔"

"تو کیا تم ہمیشہ سے رکشہ چلاتے ہو؟"

"جی نہیں صاحب۔ جب سے ملک کو آزادی ملی ہے۔" وہ خاموشی سے چند لمحے رکشا چلاتا رہا۔ پھر ماتھا ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "انگریز یہاں سے گئے، کالے صاحب آئے کہ ہماری قسمت پھوٹی۔ دیسی صاحبوں کو نہ ہمارے کام کا سمجھ نہ پرکھ۔ نہ ہم ان کے کام کے نہ وہ ہمارے، ہم نے تو درخواست دی تھی کہ ہمیں کوئی دوسرا کام نہیں آتا۔ ہمیں گورے صاحبوں کے ساتھ ولایت بھیج دیجئے پر ہماری کسی نے نہیں سنی۔"

"تو کیا کرتے تھے تم؟"

"ہم کمشنر ڈک صاحب کے ہاں کام کرتے تھے۔ پچاس روپیہ مہینہ پاتے تھے۔ رہنے کے لئے دو کمرے تھے۔ کپڑے صاحب دیتے تھے، معاف کیجئے گا ...." اور رکشا والا بات کرتے کرتے ذرا جھجکا۔

"نہیں۔ نہیں۔ کہو۔" شری واستو نے پھر اکڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو بش شرٹ آپ نے پہن رکھی ہے۔" رکشا والے نے پیچھے مڑ کر بڑے ادب سے کہا۔ "ایسی تو صاحب کے یہاں ہم پہنا کرتے تھے۔"

شری واستو پھر ڈھیلا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس کی پیٹھ بھی پیچھے لگ گئی اور سوٹ کے میلے جانے کا بھی اسے خیال نہ رہا۔

"انگریزوں کے راج میں جو موج تھی وہ اب کہاں۔" رکشا والا کہتا گیا۔ "دن تیوہار پر انعام ملتے تھے۔ ہمارے ہی نہیں بیوی بچوں تک کے کپڑے بن جاتے تھے۔ اب بتائیے

اتنا ہم کہاں سے پائیں۔ کیسے بیوی بچوں کا پورا کریں۔ لاچار ہو کر رکشا چلاتے ہیں۔ خون سکھاتے ہیں۔ کسی دن اسی طرح لڑک جائیں گے۔"

"پر آخر بات کیا ہے؟ تم کسی دیسی صاحب کے ہاں کام کیوں نہیں کرتے؟ کمشنر کی جگہ کمشنر ہے اور کلکٹر کی جگہ کلکٹر۔"

رکشا والے نے رکشا چلاتے چلاتے پھر پیچھے کی طرف دیکھا۔ "دیسی صاحب ہمیں کیا کھا کر رکھیں گے۔" اس نے کہا اور اس کے لبوں پر وہی پر حقارت طنز آمیز تبسم پھیل گیا۔

"کیا کرتے تھے تم کمشنر ڈک کے یہاں؟" شری واستو نے تجسس آمیز جھلاہٹ سے پوچھا۔ "کک تھے؟"

"جی نہیں۔ خانساماں گیری ہم سے نہیں ہوتی۔"

"تو کیا تھے۔ بیرا تھے؟"

"جی ہاں۔ بیرا تھے۔"

شری واستو پھر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ "تو اس میں کیا بات ہے تم دوسری جگہ نوکری کر سکتے ہو۔ ہمارے ہی یہاں ایک بیرا ہے۔"

"جی نہیں۔ ویسے بیرا ہم نہیں تھے۔ ہم کھانا وانا لانے کا کام نہیں کرتے تھے۔ ہم صاحب کے کپڑے دیکھتے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کپڑے وپڑے دیکھتے ہوگے۔ بوٹ ووٹ صاف کرتے ہوگے۔"

"جی نہیں۔ بوٹ تو بھنگی صاف کرتا تھا۔ ہم صرف کپڑے دیکھتے تھے۔"

"کیا دیکھتے تھے سارا دن کپڑوں کا؟"

اب صاحب آپ سے کیا بتائیں۔ آپ سمجھیں گے نہیں۔ رکشا والے نے ذرا سا مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "انگریز لوگوں کی بڑی باتیں تھیں۔ ایک وقت ایک سوٹ پہنتے تھے۔ رات کا الگ، دفتر کا الگ، دن کے آرام کا الگ، سیر سپاٹے کا الگ۔ پھر ڈنر سوٹ، گولف سوٹ، پولو سوٹ، شکار سوٹ۔ ان کو ٹھیک جگہ پر رکھنا، دھوبی کو دینا، لینا۔ صاحب کو پہنانا یہی کام تھا ہمارا۔ دیسی صاحب کیا سمجھیں اور پرکھیں ہمارا کام؟ دن رات، مہینوں برسوں ایک ہی سوٹ گھسائے جاتے ہیں۔ یہی صاحب جو اس کوٹھی میں رہتے ہیں کبھی دیکھا ہے ان کو؟"... اس نے ایک بڑی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ایسا سوٹ پہنتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کالج کے دنوں کا سنبھالے ہوئے ہیں۔ جہاں دفتر لگاتے ہیں وہاں بال روم تھا۔ سنیچر کی رات کو کیا رونقیں ہوتی تھیں اور باغیچہ دیکھا آپ نے۔ اس کی کیا درگت ہوئی ہے۔ کبھی انگریز صاحب کے زمانے میں اس کی بہار دیکھتے۔ وہی باغیچہ کیا۔ یہ ساری سول لائن پڑی انگریز صاحبوں کے نام کو رو رہی ہے۔ اتنے بڑے بڑے بنگلے، اتنے بڑے بڑے باغیچے، رانڈ کے سر کی طرح منڈے دکھائی دیتے ہیں۔"

شری واستو کو اس رکشا والے کی حقارت آمیز گفتگو اور ہندوستانی رہن سہن کے متعلق اس کے خیالات نہایت واہیات معلوم ہوئے۔ اگرچہ وہ خود انگریزی ٹھاٹ باٹ سے رہنا اور سوٹ بوٹ پہننا پسند کرتا تھا لیکن اس وقت اسے انگریزی تمدن سے متعلق ہر چیز اور ہر بات سے نفرت ہو گئی۔ اس "لاعلم" کو ذرا سا "باعلم" بنانے کے خیال سے اس نے کہا۔ "ان کے اور اپنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے میں بڑا فرق ہے۔ وہ لوگ گوشت، مچھلی کھانا، شراب پینا برا نہیں سمجھتے۔ گائے اور سور کا گوشت

کھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کو چھونا بھی پاپ ہے۔ ان کی عورتیں ناچتی ہیں ہمارے یہاں۔۔"

"کچھ نہیں جناب" رکشا والے نے اس کی بات کاٹ کر اور رکشا کے پیڈل پر اپنے جوش میں مزید زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کا دیس غلاموں کا دیس ہے۔ غریب ہونے سے ہم نے غریبی کو جنت بنا دیا ہے۔ پیسہ والے ہو کر بھی ہم عادت سے غریب بنے رہتے ہیں۔ روپیہ بینکوں میں جمع رکھتے ہیں اور دال روٹی پر صبر کرتے ہیں۔ ہم کو ہمارا صاحب بتاتا تھا کہ ہندوستان جب آزاد تھا تو لوگ خوب کھاتے پیتے، ناچتے گاتے اور عیش مناتے تھے۔ نہ یہ پردہ تھا نہ کھانے پینے پر پابندی تھی۔ ہمارا صاحب کہا کرتا تھا کہ پیسہ کا فائدہ اسے خرچ کرنے میں ہے۔ بینک میں جمع کرنے میں نہیں۔ روپیہ خرچ ہوتا ہے تو ملک کے کاریگر، مزدور، دوکاندار سب کام پاتے ہیں نہیں تو بیکاری بڑھتی ہے۔ ہمارا صاحب سال کے سال فرنیچر اور دروازے کھڑکیوں پر روغن کراتا تھا۔ چھ مہینے میں وہائٹ واش کرتا تھا۔ دو مالی، دو بیرے، خانساماں، دھوبی، بھنگی اس کے یہاں نوکر تھے۔ پھر اس کے دم سے ڈبل روٹی والے، انڈے والے، کرسی میز والے اور نہ جانے کون کون سبھی روزی پاتے تھے۔

شری واستو کے دل میں ایک شعلہ سا لپکا۔ جی چاہا کہ اٹھ کر صاحب کے اس کتے کی گدی پر زور کا ایک گھونسہ دے لیکن رکشا کافی تیز چلا جا رہا تھا۔ آخر اس نے اپنا غصہ اپنے بیش رو گورے افسروں پر اتارا۔

"ان سالوں کا کیا ہے۔ جنتا کو لوٹتے تھے۔ اور موج اڑاتے تھے۔"

"جنتا کو یہ کیا کم لوٹتے ہیں۔ رکشا والے نے پلٹ کر نہایت مسکین طنز آمیز

ہنسی کے ساتھ کہا: چھوٹے سے لے کر بڑے افسر تک سب کھاتے ہیں۔ وہاں تو بڑے افسر کچھ لحاظ کرتے تھے، یہاں تو آپا دھاپی مچی ہے۔ بس لینا جانتے ہیں، دینا نہیں جانتے۔ انگریز لیتا تھا تو دس آدمیوں کا پیٹ پالتا تھا۔ یہ کھاتے میں تو جمع کرتے ہیں۔ کھائیں اڑائیں بھی کیا، عادت بھی ہو۔ وہی دھوتی کرتہ پہنے اندر باہر سب جگہ بنے رہتے ہیں۔ پندرہویں، بیسویں، مہینے دو مہینے پر حجامت بناتے ہیں۔ نائی، دھوبی، بیرا، خانساماں کیا پالیں گے۔"

شری واستو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا لیکن خاموش رہا کہ اس کمینے کے منہ کیا لگے۔

"رودر کہیں جائیے" رکشا والا اپنی رو میں کہتا گیا۔ "رکشے تانگے والوں ہی کو لیجئے۔ بڑے سے بڑا سیٹھ رکشا کرے گا تو مول بھاؤ کرنا نہ بھولے گا۔ یہیں ایلن گنج میں ایک آنریری مجسٹریٹ رہتے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں۔ چوک میں ان کا ایک پریس بھی چلتا ہے۔ ہمیشہ یہاں اڈے پر آ کھڑے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک ہی سواری کے پیسے دینے پڑیں۔ دوسری سواری نہ ہو تو آدھ آدھ گھنٹہ کھڑے رہتے ہیں۔ انگریز معمولی فوجی بھی ہوا تو کبھی مول بھاؤ نہ کرتا تھا۔ پھر جیب میں روپیہ ہو تو روپیہ دے دیا اور دو ہوئے تو دو دیئے۔ ایک بار ہمارے صاحب کی موٹر بگڑ گئی تھی، یہیں ایلن گنج سے کچہری تک جانے میں پانچ روپے کا نوٹ اس نے رکشے والے کو دے دیا تھا۔

گیانن کا گھر آ گیا تھا۔ شری واستو اچک کر اٹھا لیکن وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ وہ ہے نہیں۔ اپنا کارڈ چھوڑ کر شری واستو مڑا اور رکشا والے سے اس نے کہا کہ

جلدی سے لے چلے۔ کچہری کے سامنے اترتے وقت گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹہ دس منٹ ہوئے تھے۔ دوسرا وقت ہوتا تو وہ دس آنے گھنٹے کے حساب سے بارہ آنے سے زیادہ نہ دیتا لیکن اس رکشاوالے کو بارہ آنے دینے میں اسے کچھ ہچکچاہٹ ہوئی۔ صاحبوں کی قبروں پر لات مارتے ہوئے اس نے کہا: "ایک گھنٹے سے کچھ ہی منٹ زیادہ ہوئے ہیں۔ دو گھنٹے بھی لگائیں تو ایک روپیہ چار آنے ہوتے ہیں لیکن یہ لو دو روپیہ۔ چودہ آنے ہماری طرف سے انعام سمجھ لو۔"

رکشاوالے نے تقریباً فوجی طریقے سے سلام کیا۔ اور شریواستو فخر سے ایڑیوں کو ذرا اٹھاتا ہوا ڈی۔ ایم۔ کی کوٹھی کی طرف چلا۔

"کیوں کیا ملا؟"

پہلے رکشاوالے نے جو ابھی تک اڈے پر کھڑا تھا زور سے پوچھا۔

"دو روپے۔"

"دو روپے؟"

"ہاں دو روپے۔ کسی دیسی صاحب سے میں نے کبھی کم لیا جو اس سے لیتا۔ سالے ان کالے صاحبوں سے نمٹنا میں ہی جانتا ہوں۔"

آخری جملے کی بھنک شریواستو کے کانوں میں پڑ گئی۔ اس کی اٹھی ہوئی ایڑیاں بیٹھ گئیں۔ جسم کا تناؤ اور رفتار کی اکڑ قدرے کم ہو گئی اور وہ عام انسانوں کی طرح چلتا ڈی۔ ایم۔ کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔

اختر اورینوی

(تبصرہ)

سید اختر احمد، اورین ضلع مونگیر (بہار) کے رہنے والے تھے۔ اردو ادب میں اختر اورینوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

اِف۔ اِس سی پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔ تین سال تک ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر تپ دق کا شکار ہو گئے۔ میڈیکل تعلیم ترک کر دی اور آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے۔ کیا۔ اگلے سال یونیورسٹی میں استاد ہو گئے۔ اختر اورینوی افسانوں کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھتے تھے۔ انھوں نے بہار میں اردو زبان و ادب کے ارتقاء پر بہت کام کیا اور افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ان کا نام آگیا۔

اختر اورینوی کے یہاں بہار کے کسانوں کی کہانیاں بھی ہیں اور شہری زندگی کے اصل خدوخال بھی ان کے افسانوں میں جھلکتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں درمیانے اور نچلے طبقے کی زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ انھوں نے درمیانے طبقے کے مسلم معاشرے کی بڑی خوبصورت

جھلکیاں دکھائی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی حقیقی تصویروں کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"کلیاں اور کانٹے"، "منظر اور پس منظر" اور "سپنوں کے دیس میں" ان کے افسانوں کے اہم ترین مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو اردو کے افسانوی ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ منظر امام لکھتے ہیں۔" اختر اورینوی نے چوالیس پینتالیس سال کی مدت میں کم و بیش سو سوا سو افسانے لکھے ہوں گے۔ ان کی افسانوی تخلیقات کے چھے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اورینوی کے افسانوں کی دنیا اپنے موضوعات کے لحاظ سے بڑی وسیع اور متنوع ہے۔ یہ افسانے کسی مقید فضا میں سانس نہیں لیتے۔ ان کا خمیر زندگی سے اٹھا ہے اور زندگی کہیں دور خلا کے اندھیروں میں پرواز نہیں کرتی۔ وہ انسانوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں ہنستی اور مایوسیوں میں آنسو بہاتی ہے۔ اورینوی کے زندگی آمیز اور زندگی آموز افسانوں پر ایک ہمہ جہت اور پر وقار شخصیت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔"

○

فٹ پاتھ

شہر میں سڑکوں کی دونوں طرف کی دنیا ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی۔ کہیں بھرے بازار کے درمیان سڑک یوں نرمی سے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے جیسے مشتاقوں کے ہجوم میں حسن سر محفل۔ آمد و رفت کی کثرت سے کھوے سے کھوے چھلتے ہیں۔ کہیں شاندار رہائشی محلوں سے اس کا گزر ہوتا ہے۔ دو طرفہ نئی وضع کی کوٹھیاں، سبزہ زار احاطے، دھنک کی طرح رنگ برنگ کی ہنستی ہوئی کیاریاں، جدید فیشن کے لباس ناز فرماتی ہوئی ساریاں، نغمہ زن بالاخانے اور دھوم مچاتی ہوئی موٹریں اور کہیں مفلوک الحال حلقوں کا جگر چیرتی ہوئی یہ سڑکیں یوں تیر جاتی ہیں جیسے اپنی ہوئی تلوار۔

بڑی سڑکوں کے حاشیوں پر فٹ پاتھ کا وجود ان کے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ سڑکوں کی بہ نسبت فٹ پاتھ کی دنیا ذرا آہستہ خرام کرتی ہے۔ سڑک ندی کے درمیانی دھارے کی طرح ہوتی ہے اور فٹ پاتھ موج ساحل آشنا کی مثال۔ مگر فٹ پاتھ کی دنیا حرکت و سکون دونوں کے مناظر پیش کرتی ہے۔ لہٰذا زیادہ دلچسپ ہے۔ رہرو کے علاوہ فٹ پاتھ کی آغوش میں بہت سی ہستیاں ہوتی ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور اشرف المخلوقات بھی۔ جی ہاں، اشرف المخلوقات بھی جس پر حوریں رشک

کریں اور جن کے سامنے فرشتے سجدے میں گریں۔

میونسپلٹی کے ٹین اپنی الابلا، کوڑے کرکٹ، بہاروں کے ساتھ ایسے دکانداروں کے پلنگ جو صرف نفع کمانا، قانون کو دھوکا دینا اور ساری دنیا کو اپنا سمجھنا جانتے ہیں۔ صرف پلنگ ہی نہیں بنچ، کرسیاں، ٹوکرے، دیودار کے بکس وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستانی وزیروں کی طرح موٹے تازے، بکتے دکتے مگر مجبور و پابہ گل لیٹر بکس اور حیوانات میں بکریاں، گائے، گھوڑے، گدھے، کتے اور سب کے سبھا پتی سانڈ۔ دوسروں کی کمائی کھانا، خود بیکار رہنا اور دندنانا۔ ویسے ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور زمینداروں کی طرح سانڈ بھی کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ نباتات میں میوے کی بڑی دکانوں سے پھینکے ہوئے چھلکے اور ایسی ٹوکریوں کے بیر، خراب و خستہ کیلے اور آدھی سڑی ہوئی نارنگیاں جن کی پوری کائنات ایک گوشے میں سما جاتی ہے۔ غرض یہی ہستیاں فٹ پاتھ کی رونق ہوتی ہیں۔ مگر جو اشرف المخلوقات نہ ہوتا تو آسمان و زمین، جمادات، نباتات و حیوانات کہاں ہوتے۔ فٹ پاتھ پر اشرف المخلوقات بھی ہوتے ہیں، مسلسل صدا لگائے ہوئے فقیر، اپاہج بھک منگے، بھٹکتے ہوئے کوڑھی جو اپنے ٹھنٹھ ہاتھوں کو دکھا کر صرف سوالیہ اشارے کرتے ہیں۔ ایسے زار و نزار محتاج جو برائے نام سا چیتھڑا سامنے بچھا کر بے حس و حرکت لیٹے رہتے ہیں بلکہ درجن سے زیادہ گندے اور ادھ موئے بچوں والی عورت جو بیر یا شکرقند رکشا والوں اور قلیوں کے ہاتھ بیچتی ہیں۔ ایک پلا ہوا بچہ ریڑ کرتی سے ڈھکی ہوئی خشک چھابڑی کو اس طرح چاٹتا ہوا جیسے کوئی غریب بچہ آم کے پھینکے ہوئے چھلکوں کو رس گل جانے کے بعد بھی چاٹ لینا پسند کرے۔ میلے برقعے کے اندر سے نکیاتی ہوئی سائل عورت

چائے کی پھینکی ہوئی سیٹھی سے بننے والی چائے بیچنے والے اور ان کے گرد بیکار اور تھکے ہوئے مزدوروں اور راتوں کو انھیں فٹ پاتھوں کے سینوں کی دبی ہوئی آگ دہک اٹھتی ہے۔ خالی خولی ہانڈیوں میں چند دانے ابلتے ہیں۔ پانی کے ابال کی آواز دھرتی کی کراہ معلوم ہوتی ہے۔ بھوکے پیٹوں کو جگا کر فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والے سونے کی نقل کرنے کے لئے زمین پر دراز ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کا چکر چلتا رہتا ہے اور قسمت کے بہانے برداشت کر لیا جاتا ہے۔

آج میں آپ کو فٹ پاتھ ہی سے متعلق ایک کہانی سنانے والا ہوں۔ نہ جانے کتنی ان کہی اور ان سنی کہانیاں فٹ پاتھوں سے گرد راہ کی طرح لپٹی ہوئی ہوں گی۔

دس سال کی عمر کا ایک لڑکا میرے مکان کے سامنے سڑک کے چھوٹے سے پل پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں پھیلائے ہوئے، بے پروا، آزاد، کمر میں لنگوٹی۔ کسی بے شرم کی یوں ہی سی لاج کی طرح چپکی ہوئی۔ گردن سے ایک میلا ڈھیلا ڈھالا، جور جور کسی کا اتارن کرتا جھول رہا تھا۔ شکستہ کرتے کے چاکوں کو ایک حد تک چھپانے میں سیاہ مرزئی مدد دے رہی تھی جو خود بھی اکثر جگہ خندۂ دنداں نما کی شکل پیدا کر رہی تھی۔ یہ مرزئی بھی یوں تھی جیسے چھوٹے تکیے کے اوپر کوئی گاؤ تکیے کا خول پہنا دے۔ کرتا جانگھ تک آتا تھا اور سامنے پھٹے ہونے کے سبب جسم زیریں کی عریانی کو دور کرنے کی بجائے اس کے ننگے ہونے کا پردہ فاش کر رہا تھا اور اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور اس کے سیاہ ہاتھ پاؤں پر گرد کی تہیں نمایاں طور پر جمی ہوئی تھیں۔ زمین کی خاک اور جسم کے پسینے نے مل کر ایک ابٹنا تیار کیا تھا۔ وہ شاید بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔ سہ پہر کی دھوپ نے جا بجا پسینہ چلا کر ابٹنے کو ہلکا کر دیا تھا۔ سر کے بال پسینے میں چپک رہے تھے۔

وہ سنہری دھوپ سے لطف اٹھا رہا تھا۔ دنیا سے لاپروا ہو کر وہ اپنی مرضی کے اوپر کی چیلیں مار رہا تھا اور گاہ گاہ اپنا بدن تیزی سے کھجا لیا کرتا تھا۔ میرا محلہ شہر کا ایک خاموش حصہ تھا۔ دو جانب کالج کے کوارٹر تھے۔ تیسری جانب دریا اور چوتھے جانب درمیانی اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے کچھ مکانات۔ وہ نہ جانے ادھر کیسے آنکلا۔ شاید پکنک کے لئے روزمرہ کے ہنگاموں سے تنگ آکر محض یوں ہی آج اس کی ٹانگیں ادھر ہی اسے لے آئیں۔ جاڑے کے دن تھے۔ دسمبر کا مہینہ۔ اسے دھوپ میں بڑے اطمینان و سکون سے بیٹھا دیکھ کر یہ اثر ہوتا تھا جیسے کوئی بچہ ماں کی گود میں عالم رنج و حسرت کو بھول کر آسودگی و طمانیت کے ساتھ بیٹھا ہوا ابدیت کے ساتھ رشتہ جوڑ رہا ہو۔

میرا ملازم اسے بلا کر میرے مکان کے اندر لے آیا۔ پہلے تو اس نے پکار تک نہ سنی۔ وہ اتنا محو تھا۔ شور کرنے سے وہ چونکا مگر شان سے بل ہی پر بیٹھا رہا۔ جب اسے اندر بلایا گیا تو اس نے بہت ہی مشکوک تیور سے ماحول کو بھانپا اور پھر چیلیں مارنے لگا۔ خوشامدیں کرنے، چمکارنے اور دلاسا دینے پر مشکلوں سے وہ کشاں کشاں یوں اندر لایا گیا جیسے چھتر کے میلے سے ایک نئے اڑتے ہوئے گریزاں بچھڑے خرید کر کوئی کسان ڈریاتا ہوا لئے جا رہا ہو۔

شاید وہ کچھ بہرا بھی تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں پھولیاں تھیں۔ ایک میں زیادہ، دوسری میں کم۔ وہ گھر کی چار دیواری کے اندر گھبرایا گھبرایا سا معلوم ہو رہا تھا۔ نو گرفتار پرندے کی طرح سائبان سے دوڑ کر وہ انگنائی میں چلا گیا اور کنوئیں کی منڈیر پر لاپروائی سے بیٹھ گیا۔ گردن نیچی کئے ہوئے وہ شرما کر دانت نکالے آہستہ

آہستہ ہنس رہا تھا۔ اس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ بھٹی سے لٹے ہوئے جیسے دانتوں پر سونا چڑھایا جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے کھانا دیا۔ وہ بمشکل کھانے پر راضی ہوا مگر جب کھانے لگا تو بھوکے کتے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ صحن میں بیٹھا بیٹھا جب وہ رکابی صاف کر چکا تو تیزی سے گرسنہ بھیڑیے کی طرح وہ باورچی خانے میں گھس گیا اور کھانے کی مزید چیزیں تلاش کرنے لگا۔ قاب، ہانڈیاں، پیالے، ٹھکریاں سب اس نے الٹ پلٹ کرنی شروع کیں، باورچی نے اسے ڈانٹ بتائی۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ یہ بدتمیزی ہے اور کھانا ہو تو مانگ کر کھایا کرو۔ مگر یہ باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ اس وقت تک بے چین رہا جب تک اسے کچھ اور کھانے کو نہ مل گیا۔ دوبارہ کھا کر بھی اس کے تقاضے جاری رہے۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اب رات کو کھانا بھر پیٹ بھر لے گا۔ وہ کچھ مایوسی اور جھلاہٹ کے عالم میں رکابی سے دال اور شوربا چاٹنے لگا۔ چاٹ واٹ کر رکابی کو ایک طرف نہایت ہی بے توجہی سے سرکا دیا اور کنوئیں کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا۔ بے تعلق سا، بے حس، بے فکر، وہ بہت ہی کم باتوں کا جواب دیتا تھا۔ ہم لوگوں کو گملوں اور چمن کی آبپاشی کے لئے ایک ایسے چھوکرے کی ضرورت تھی جو اوپر کے اور کام بھی کر دیا کرے۔ اس لونڈے کو ہم نے خداداد سمجھا۔ کم دانے گھاس میں یہ بہت سے کام کر دیتا۔ خود غرضی اور جذبہ ترحم نے مل کر ہم میں یہ شدید خواہش پیدا کی کہ کسی طرح یہ باد آورد ہمارے ہاں ٹک جائے۔ ہم لوگوں نے اسے سمجھانا شروع کیا کہ وہ نوکر ہو کر یہاں اگر رہ جائے تو اسے خوب کھانے کو ملے گا۔ اچھے صاف صاف کپڑے پہننے کو ملیں گے اور پیسے بھی۔ وہ چپ سنتا رہا۔ کبھی کبھار اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس دیتا۔ عجیب طرح

کی بے تعلق، بے جذبے کی کھوکھلی سی ہنسی۔ ہم لوگوں نے اسے نہانے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اسے نہانے کو کپڑا دھونے والا صابن دیا گیا۔ اس نے اسے سونگھا، منہ بنا لیا۔ پھر ہنستا ہوا نہانے کے لئے نل پر بیٹھ گیا۔ اسے ایک پرانا ہاف پینٹ اور ایک پرانی قمیص دی گئی۔ اس نے خوش خوش انھیں پہنا۔ بٹن لگاتے وقت اسے بڑا لطف آ رہا تھا۔ کئی بار بٹن کھول کھول کر انھیں لگائے۔ وہ جدت کا لطف لے رہا تھا۔ اپنے کرتے اور مرزئی میں اس قسم کی نامعقول بندشیں نہیں تھیں۔ نہا دھو کپڑے بدل کر وہ سیدھا باورچی خانے میں گھس گیا اور اب کے اس نے باورچی سے بہ منت کچھ اور کھانے کو مانگا۔ چند سوکھی روٹیاں اسے دے دی گئیں اور اس نے انھیں ہفتوں کے بھوکے کی طرح دو تین لقموں میں ختم کر دیا۔ کھا کر وہ اٹھا اور اپنے پھٹے پرانے کرتے میلی چکٹ لنگوٹی اور چیلڑوں سے اٹی ہوئی مرزئی کو لپیٹ لپاٹ کر سنبھال کے آنگن کے ایک گوشے میں ٹوٹے ہوئے گھڑے پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ اور غیر متوقع جرأت سے سوال کیا:

"کتنا مشاہرہ دو گے؟"

میں نے کہا "ٹھکانے سے کام کر۔ کھانا، کپڑا، مشاہرہ سب ملیں گے۔"

کہنے لگا: "نہیں بول دو کتنا ملے گا؟"

میں نے ہنس کر کہا: "ابے تو مشاہرہ لے کر کیا کرے گا؟ خوب بھر پیٹ کھایا کر اور پیسے لے لیا کر دو ایک۔"

"اونہہ! تب ہم نہیں رہیں گے۔"

"مشاہرہ بھی ملے گا۔ تو گھبراتا کیوں ہے؟ تیرا گھر کہاں ہے؟ میں نے اسے

تسلی دی۔

"مجھپھڑ پور ضلع۔"

میں نے دریافت کیا "ماں باپ ہیں؟"

اس نے کہا: "نہیں! کوئی نہیں!" اور نفی میں زور سے سر ہلاتا رہا۔

"بھائی بہن؟"

"کہہ تو دیا کوئی نہیں۔" وہ بگڑ سا گیا۔

"اچھا تجھے مشاہرہ دوں گا۔ میرے پاس جمع کرانا، اس سے بہت سے کپڑے بنا لینا اور مٹھائیاں کھانا۔"

"نہیں مشاہرہ ہاتھ میں لیں گے۔"

"ہاتھ میں لے کے کیا کرے گا؟ پھینک دے گا، اور کیا! یا گر جائیں گے روپے کہیں۔"

"نہیں! ہم کو مکان بنانا ہے۔" اس نے شان و وقار کے ساتھ کہا۔ میں بھی چونک گیا اور سب لوگ ہنسنے لگے۔ اسے چوٹ سی لگی کہنے لگا۔

"میرے بھی مکان ہے جی! جلجلہ میں گر گیا ہے تھوڑا۔ وہ کوٹھری ہے۔ اس کے سیاہ چہرے پر خون نے دبے ہوئے تو ے کا رنگ پیدا کر دیا۔

میں نے کہا: "اچھا بنانا مکان تیرے ہاتھ میں روپے دوں گا۔" وہ خوش ہو گیا اور ہنسنے لگا۔ اس نے یہ بھی نہ پوچھا پھر کتنا مشاہرہ ہو گا۔ اس کے دل میں بھی حسرت تعمیر اور تمنائے ملکیت تھی۔ اسی حسرت، اسی تمنا کے پورا ہونے کا تصور ہی اتنا خوش کن تھا کہ وہ سرمست ہو گیا۔

وہ مکان کے بیرونی احاطے میں جاکر بیٹھ رہا۔ جب اسے کسی کام کے لئے بلایا جاتا تو وہ چلا آتا اور کام کو ادھورا ہی چھوڑ کر پھر باہر احاطے میں جا بیٹھتا۔ اسے ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔ ہم لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ ابھی زور دینا ٹھیک نہیں۔ چپ ہو رہے کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ اب رات ہو چلی اور وہ مزے میں صحن میں بیٹھا رہا۔ کھانا کھانے کے لئے اندر آیا اور پھر باہر چلا گیا۔ بڑی دقتوں سے اسے سلانے کے لئے اندر لایا گیا۔ اب وہ کوٹھری کے اندر سونے پر رضامند نہیں۔ رات بھر وہ سائبان ہی میں سوتا رہا۔ غضب کی سردی تھی۔ مگر وہ تو کھلی فضا کا پنچھی تھا۔ اسے اوڑھنے کے لئے کمبل دے دیا گیا جسے اس نے نہایت استغنا کے ساتھ سرسری طور پر لے لیا۔

صبح ہوتے ہی وہ احاطے میں جا پہنچا۔ صرف قمیص اور ہاف پینٹ پہنے ہوئے اسے بلا کر چولھے کے پاس باورچی خانے میں بٹھایا گیا۔ وہاں وہ چپکا بیٹھا رہا۔ جب ہم لوگوں کے ناشتے کے بعد اسے روٹی کھانے کو مل چکی تو میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"ہم جاکے چادر لی آویں؟"

میں نے پوچھا: "کہاں ہے تیری چادر؟"

اس نے نہایت صفائی سے جواب دیا: "فٹ پاتھ پر۔"

"ارے فٹ پاتھ پر کہاں؟"

"جہاں ہم رودج سوتے تھے۔ حاط کے ٹٹی میں لکا کے رکھ دیا ہے۔"

اب وہ جانے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے کہا: "تجھے دوسری چادر مل جائے گی مت جا۔"

مگر اس نے ایک نہ سنی اور جانے پر مصر ہوا۔ ملازموں نے اسے زبردستی روکنا چاہا تو وہ زور زور سے رونے لگا۔

میں نے آخر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ چھلانگ لگا کر احاطے کے اندر چلا گیا اور وہاں سے یک بیک لوٹ کر اندر آیا۔ اس نے صحن کے گوشے میں جاکر قمیص اتار دی۔ اپنا میلا سا ربوڑ کرتا اور مرزئی پہنی اور ہاتھ میں لنگوٹی کا چیتھڑا لے کر باہر جانے لگا۔

میں نے اسے کہا: "ارے یہ کیا! اپنی چادر لے کر تو واپس نہیں آئے گا کیا؟"

وہ بلا جواب دیئے پھرتی سے احاطے سے باہر نکل گیا اور پھاٹک سے باہر ہو کر دوڑتا ہوا بھاگا۔ یہ جا وہ جا۔

فٹ پاتھ اُسے آواز دے رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی آواز سن لی۔ کل کا بھولا بچہ اپنے گھر لوٹ چکا تھا۔

اختر انصاری

(تبصرہ)

اختر انصاری کا آبائی وطن بدایوں ہے لیکن ان کا بچپن دہلی میں اور بعد کی ساری زندگی علی گڑھ میں گزری۔ اختر انصاری ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ باپ دہلی میں سول سرجن تھے۔ چنانچہ بی۔ اے۔ آنرز کرنے کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیجا۔ لیکن ابھی انھیں وہاں بہت دن نہیں گزرے تھے کہ اچانک ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور اختر انصاری کو بڑے بیٹے ہونے کی بنا پر ایک بڑے گھر کی ذمہ داری سنبھالنا پڑی۔

اختر انصاری نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک اسکول میں ملازمت کرلی۔ چند سال بعد وہ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد شعبہ اردو سے منسلک ہوگئے اور پھر شعبۂ تعلیم میں داخل ہوئے اور جہاں ایک اعلیٰ درجے کے معلم کی طرح کام کرنے کے بعد ۱۹ء میں ریٹائر ہوگئے۔

اختر انصاری نے شعر و شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ وہ غزلیں

بھی کہتے تھے اور غزلیں، رباعیاں اور قطعات ــــ لیکن قطعات میں ان کی حیثیت منفرد تھی۔ اختر انصاری نے افسانے کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ادب میں پریم چند کا بول بالا تھا۔ پریم چند کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے اختر انصاری نے اردو افسانے میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کے افسانے کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں ــــ اندھی دنیا، نازو، خونی اور یہ دنیا۔

اختر انصاری کے افسانے پر جہاں پریم چند کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں وہاں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی خاصے متاثر ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھوک، افلاس، بے کاری، جہالت اور طرح طرح کی محرومیوں کی عکاسی ملتی ہے۔ اختر انصاری نے خارجی زندگی میں جو کچھ دیکھا، اس سے تاثر قبول کرتے ہوئے۔ اس کو کرداروں کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں مشاہدہ کی تیزی اور جذبات کی شدت صاف طور پر نظر آتی ہے۔

اختر انصاری کی نظر معاشرے کے تضاد پر پڑتی ہے۔ انھیں انسانوں اور انسانوں کے درمیان امیری اور غریبی، سماج کے اونچے نیچے طبقوں میں، غرض ہر جگہ اور اس تضاد سے پیدا کئے ہوئے نفسیاتی نتیجوں کا عملی واضح طور پر نظر آتا ہے اور اسے وہ بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

اختر انصاری کی افسانہ نگاری کے ہر دور میں ذکر و فکر کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں سادگی بھی ہے اور اس سادگی میں پرکاری بھی ــــ انھوں نے زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے بیان میں سادگی بھی ہے اور دلکشی بھی۔ پلاٹ کا اچھوتا پن بھی ہے اور

زبان کی صفائی اور ستھرائی بھی۔ ان کے یہاں حقیقت کی عکاسی بھی ہے اور طنز کے گہرے نشتر بھی۔

اردو افسانے کی تاریخ میں اختر انصاری کا نام ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

اختر انصاری نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے مقالے "افادی ادب" سے اردو میں ترقی پسند تحریک کو بڑا سہارا۔ الغرض شعر و شاعری، افسانے اور تنقید ہر میدان میں اختر انصاری نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔

○

اٹھارہ آنے

سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے سیٹھ جی کے مکان کا دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکھٹایا گیا۔ گھر میں جتنے آدمی تھے ــ سیٹھ جی، ان کی بیوی، لڑکے، لڑکیاں، نوکر چاکر اور تین چار رشتے دار جو صبح سے ان کے یہاں پناہ گزیں تھے ــــ سب کے کلیجے کانپنے لگے اور چہرے زرد پڑ گئے "مسلمان غنڈے آن پہنچے!" ــــ یہ خیال یک بیک ہر شخص کے دل پر چھا گیا۔

گذشتہ شام کو قصبے کے بنیوں اور قرب و جوار کے مسلمان دیہاتیوں کے درمیان غلّے کی خرید و فروخت پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ صبح تک اس معمولی جھڑپ نے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کر لی۔ قصبے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، مگر صاحبِ زر طبقہ حسبِ معمول ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دولت مند مہاجنوں اور مالدار بنیوں کے لئے یہ وقت بہت ہی نازک تھا۔ ان کو اپنی جان کی حفاظت کے علاوہ دھن دولت کی رکھوالی بھی کرنی تھی۔ سیٹھ جی قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے اور درمیانی طبقے کے فاقہ کش مسلمانوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے، اس لئے اور بھی کہ انھوں نے اپنی ساری دولت اسی

قصبے کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کر جمع کی تھی۔ بیس سال پیشتر جب وہ اس قصبے میں ایک پھٹا ہوا کرتا اور ایک میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے تن تنہا وارد ہوئے تھے تو اُس وقت ان کی کل پونجی ایک خوانچہ تھا جس میں اٹھارہ آنے کا مال تھا۔ بہت دنوں تک وہ اسی طرح گلیوں اور کوچوں میں گھوم پھر کر اپنا مال بیچتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک دوسرا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ یعنی کسی کو چار آنے ادھار دے دیئے، کسی کو آٹھ آنے، کسی کو ایک روپیہ، کسی کو ڈیڑھ روپیہ۔ کچھ دنوں بعد وہ ایک دکان پر بیٹھ کر اپنا مال بیچنے لگے۔ پھر یہ دکان ایک صرافے میں تبدیل ہوگئی۔ سیٹھ جی نے زمینوں اور جائدادوں کو نیلام کرا کرا کے اپنی ملکیت بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ قصبے کی اندرونی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے تصرف میں آگیا۔ بیس سال کی مسلسل اور پیہم جانفشانی کے بعد اب وہ قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ چنانچہ علی الصباح جب انھیں بلوے کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے پختہ مکان کا بڑا دروازہ اندر سے مقفل کرا لیا اور متعلقین و ملازمین سمیت اس قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ دن بھر یہ لوگ خوف و ہراس میں مبتلا رہے اور سہمی ہوئی دعاؤں کے ساتھ بھگوان کو یاد کرتے رہے۔ مگر جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہی۔ یعنی شام ہونے سے ذرا پہلے مکان کا دروازہ بڑے زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ دستک کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دروازے پر دو ایک آدمی نہیں، بلکہ پورا مجمع ہے۔ سب کے چہرے زرد ہو گئے اور کلیجے کانپنے لگے۔ ہر شخص نے اپنے دل میں یہی سوچا کہ مسلمان غنڈے آن پہنچے۔

تین نوکروں نے سارا دن چھت پر گزارا تھا۔ وہ اب بھی پتھروں اور اینٹوں کے ایک بہت بڑے انبار کے درمیان وہیں موجود تھے۔ انھوں نے منڈیر پر سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہاں نہ مسلمان غنڈے تھے نہ ہندو لفنگے، بلکہ پولیس کے تقریباً نصف درجن آدمی خاکی وردیاں اور لال پگڑیاں پہنے ہوئے دروازے کو شدت کے ساتھ پیٹنے میں مصروف تھے۔

سیٹھ جی کو معلوم ہوا کہ دروازے پر پولیس کے آدمی ہیں تو ان کی جان میں جان آئی۔ بالائی منزل کے ایک کمرے سے سیٹھ جی کے بھتیجے نے اپنا گھٹا ہوا سر باہر نکالا اور دستک دینے والوں سے چند سوالات کئے۔ جواباً انھیں بتایا گیا کہ شہر سے کلکٹر صاحب نے پولیس کے حکام کو بھیجا ہے اور وہ سیٹھ جی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

اس معمولی تحقیق کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ اور سیٹھ جی پولیس کے حکام کو نہایت عزت کے ساتھ اندر لے گئے۔ حکام کی اس جماعت میں ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹبل اور دو کانسٹبل تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر دونوں اپنے اپنے جوتوں سمیت صاف ستھری چاندنی پر چڑھ گئے اور گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئے۔ ہیڈ کانسٹبل بھی جوتا پہنے پہنے چاندنی پر جا بیٹھا۔ کانسٹبلوں نے البتہ ذرا تمیز اور انسانیت سے کام لیا۔ جوتا انھوں نے بھی نہیں اتارا، لیکن اتنا ضرور کیا کہ چاندنی پر بیٹھنے کی بجائے دروازے کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گئے۔ یعنی اس جگہ جہاں انسپکٹر، سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹبل کو اپنے اپنے جوتے اتار دینے چاہئے تھے۔

"فرمائیے، کیا حکم ہے؟" سیٹھ جی نے تعظیماً ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

سیٹھ جی نے سب انسپکٹر صاحب کو اپنا مخاطب بنایا تھا۔ سب انسپکٹر صاحب نے انسپکٹر صاحب کی جانب دیکھا، اور انھوں نے کہنا شروع کیا: "بات یہ ہے رائے صاحب! کہ بلوے کی اطلاع کلکٹر صاحب کو صبح سویرے پہنچ گئی تھی اور ہم لوگ راج پور سے فوراً بلائے گئے تھے مگر کپتان صاحب نے حکم جاری نہیں کیا تھا اس لئے ہمیں دیر ہوگئی .... یوں سمجھئے کہ .... اے .... اے ....

دیوان جی! کپتان صاحب کا حکم کس وقت ملا ہے ہمیں؟"

"یہی کوئی چار ساڑھے چار بجے ملا ہے حضور!" ہیڈ کانسٹبل نے پھرتی سے جواب دیا۔

"وہ حکم تو ہوگا تمھارے پاس؟" سب انسپکٹر صاحب نے ضمناً کہا۔ "لائے ہو اپنے ساتھ؟"

"جی ہاں حضور لایا ہوں — بستے میں ہے — باہر موٹر پر — حضور کہیں تو لاؤں۔" یہ کہتے ہوئے دیوان جی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگے، مگر سب انسپکٹر صاحب فوراً انسپکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس لئے ان کی کوشش، جہاں تھی وہیں ختم ہوگئی۔

انسپکٹر صاحب نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "بس رائے صاحب! تو یہ سمجھئے کہ حکم ملتے ہی ہم فوراً روانہ ہوگئے۔ اگر حکم جلدی مل جاتا تو آپ کو دن بھر یہ پریشانی اٹھانی نہ پڑتی...."

"بڑی کرپا — بڑی کرپا۔" سیٹھ جی نے گھبراتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے

ہوئے کہا، "تو — تو — ہونہ — ہونہ —"

انسپکٹر صاحب نے سیٹھ جی کی گھبراہٹ اور الجھن کو تاڑ لیا اور بولے: "تو کلکٹر صاحب کی مہربانی سے یہ انتظام ہوگیا ہے کہ قصبے کے سارے رئیس اپنا مال شہر پہنچا دیں اور خزانے میں جمع کرا دیں۔ ہم لوگ اسی غرض سے آئے ہیں۔ کوتوال صاحب نے کہا تھا کہ سب سے پہلے رائے صاحب کے ہاں جائیے گا۔"

سب انسپکٹر صاحب ہیڈ کانسٹبل اور کانسٹبلوں سے مخاطب ہوئے۔

"معلوم ہوتا ہے اس قصبے میں مسلمان غنڈوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"کچھ نہ پوچھئے حضور!" دیوان جی نے کہا: "ایک سے ایک چھٹا بدمعاش یہاں موجود ہے۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو لمبی لمبی سزائیں کاٹ چکے ہیں۔"

"یہ مسلمان تو سبھی غنڈے ہوتے ہیں سرکار!" ایک کانسٹبل بولا۔ "بھلا مانس تو ان میں ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتے ہیں...."

سیٹھ جی کے سوا تقریباً ہر شخص نے "مسلمان غنڈوں" کے غنڈے پن پر اظہار خیال کیا۔ سیٹھ جی کچھ فکر مند معلوم ہوتے تھے۔

مسلمان غنڈوں کو جی بھر کر گالیاں دے لینے کے بعد انسپکٹر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے: "تو رائے صاحب! ذرا جلدی کیجئے۔ ہمیں لالہ مول چند سے بھی ملنا ہے...."

"میں یہ کہتا تھا" سیٹھ جی بولے: "کہ آپ .... میرا مطلب ہے ٹھاکر

رسال سنگھ نہیں آئے ....؟" ٹھاکر رسال سنگھ قصبے کے تھانیدار کا نام تھا۔

"اجی رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے قدرے بیزار اور بیقرار ہوکر کہا، "ٹھاکر رسال سنگھ کو اتنی فرصت کہاں ہے! وہ اپنے انتظامات میں مصروف ہیں۔ کل سے بیسیوں قتل ہو چکے ہیں...."

سب انسپکٹر صاحب پھر ہیڈ کانسٹبل اور کانسٹبلوں سے مخاطب ہوئے۔

"کیسے برے وقت ہوا ہے یہ بلوہ! ادھر تحصیلدار صاحب بیمار ہیں، ادھر ایس۔ ڈی۔ او چھٹی پر ہے...."

دیوان جی نے ہاں میں ہاں ملائی اور تھوڑی دیر تک بلوے کی ہولناکیوں اور انتظامات کی غیر تسلی بخش حالت پر گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ جی نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا، گو ان کا بھتیجا اپنے گھٹے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیر پھیر کر خوب باتیں ملاتا رہا۔

پھر یکایک سیٹھ جی بولے، "ایک بڑی مشکل ہے انسپکٹر صاحب! میں اب اس وقت گھر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟ بلوے کا زمانہ ہے، ایسی حالت میں...."

انسپکٹر صاحب نے جلدی سے کہا، "تو آپ کو ایسا کون سا بہت دور جانا ہے۔ آدھ گھنٹے میں شہر پہنچ جائیے۔ وہاں آپ کو چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے...."

سب انسپکٹر صاحب بہت بے پروائی سے بولے، "ہم لوگوں کو واپس تو آنا ہی ہے۔ آپ کو کار میں بٹھاتے لائیں گے۔ ہمیں تو کئی پھیرے کرنے ہیں۔

لالہ مول چند سے ملنا ہے۔ پنڈت سیتا رام سے ملنا ہے...."

"رات بھر کا چکر ہے حضور!" دیوان جی بولے۔

"رات بھر کا نہیں تو گیارہ بجے تک کا تو کام ہے ہی۔" سب انسپکٹر صاحب نے کہا۔

سیٹھ جی مطمئن ہو گئے اور چند رسمی اور غیر ضروری باتوں کے بعد "بڑی کرپا! بڑی کرپا!" کرتے ہوئے اندر گئے۔

تھوڑی دیر میں انھوں نے اپنی بیس سال کی کمائی باہر نکال کر رکھ دی۔ جواہرات، سونے کے زیورات، چاندی کے ظروف، نوٹوں کی گڈیاں....

چیزوں کی فہرست بنانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے کہا، "یہ کام تو آپ وہیں کیجئے گا۔ کلکٹر صاحب کے سامنے۔ اب یہاں زیادہ دیر کوئی مناسب نہیں۔"

سیٹھ جی مع اپنی بیس سال کی کمائی کے موٹر میں بیٹھ گئے اور موٹر روانہ ہوئی۔

"ذرا جلدی چلو بھئی۔" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور سے کہا، "ابھی رائے صاحب کو واپس بھی لانا ہے۔"

"ہاں صاحب۔" سب انسپکٹر صاحب بولے۔ "سیٹھ جی کو جلد سے جلد واپس گھر پہنچا دینا چاہیے۔ بلوے کا زمانہ ہے۔ بال بچے پریشان ہوں گے۔"

"اجی توبہ کیجئے،" انسپکٹر صاحب نے کہا، "بھلا کسی کی مجال ہے جو رائے صاحب کے بال بچوں کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔ آخر ہم کس لئے ہیں؟"

"آپ کی دیا ہے انسپکٹر صاحب!" سیٹھ جی نے ممنون ہو کر کہا۔ "میں تو

آپ کی رعایا ہوں۔"

"اجی رائے صاحب! انسپکٹر صاحب اچھل کر بولے، "بھلا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ آپ کی خدمت بجالانا ہمارا فرض ہے۔ اور پولیس کا سب سے پہلا کام تو آپ کے جان و مال کی حفاظت ہے۔ آپ اس قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہیں....."

"یہ سب بھگوان کی دیا ہے اور آپ کی دعاؤں کا اثر ہے۔" سیٹھ جی نے کہا، "ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایک غریب دیہاتی کا بیٹا ہوں۔ آج سے بیس سال پہلے میں اس قصبے میں اٹھارہ آنے لے کر آیا تھا۔ آج بھگوان کی دیا سے....."

"اٹھارہ آنے!" پولیس کے حکام نے بیک وقت حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں، میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اس قصبے میں آیا تھا۔ یہ سارا دھن اسی کی پیداوار ہے۔"

پولیس کے حکام نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے:۔

"خوب! بہت خوب!"

"کیا کہنا ہے سیٹھ جی! واہ! واہ!"

"اجی آپ اس کو اٹھارہ آنے کی پیداوار کیوں کہتے ہیں؟ اپنی محنت اور مشقت کی پیداوار کہئے۔"

"بیشک! بیشک! یہ سیٹھ جی کی محنت اور ایمانداری کا پھل ہے!"

سیٹھ جی پھول کر کپا ہو گئے۔ مزے میں آکر کہنے لگے، "آگے چل کر یہ سڑک

جہاں مڑتی ہے بس وہیں میرا گاؤں ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اٹھارہ آنے کا سودا خرانچے میں رکھ کر میں اپنے گاؤں سے چلا تھا اور اسی سڑک پر بہتا ہوا قصبے میں داخل ہوا تھا....."

وہ اپنے مہاجنی سفر کی ابتدا کا قصہ بیان کر رہے تھے کہ اتنے میں کار سڑک کے اس موڑ پر پہنچ گئی جہاں ان کا گاؤں واقع تھا۔

"ٹھہرو!" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

کار رک گئی۔

انسپکٹر صاحب نے کار سے اتر کر چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالی اور کہا، "رائے صاحب! کس طرف ہے آپ کا گاؤں؟"

سیٹھ جی کار سے اترے اور ہاتھ کے اشارے سے اپنا گاؤں بتلانے لگے۔

"وہ — وہ دیکھئے — وہ جو درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا ہے....."

لیکن انسپکٹر صاحب نے درختوں کے جھنڈ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکالتے ہوئے بولے۔ "تو رائے صاحب! آپ اٹھارہ آنے اس جگہ سے لے کر روانہ ہوئے تھے؟"

"جی ہاں، میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اسی راستے سے قصبے میں....."

"تو یہ لیجئے اٹھارہ آنے حاضر ہیں!"

سیٹھ جی انسپکٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔

"لیجئے، بھی تکلف کیا ہے۔"

سیٹھ جی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"لیجئے رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا۔ "اپنے اٹھارہ آنے واپس لیجئے۔ آپ تو اس رقم کو بہت بڑی دولت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے ایسا کیا، اب ہماری خاطر سے ایک دفعہ اور سہی۔" اور انھوں نے زبردستی سیٹھ جی کے ہاتھ میں پیسے دے دیئے۔

"اچھا اب بیس سال کے بعد ہم آپ سے پھر ملاقات کریں گے!" یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب کار میں بیٹھ گئے اور کار روانہ ہوگئی۔

سیٹھ جی کو ہوش آیا تو ان کے چاروں طرف ایک خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں ان کو دو چمکتی ہوئی چیزیں اپنی ہتھیلی پر نظر آئیں ــــ ایک روپیہ اور ایک دونی!

یہ شاید ایک دوسرے مہاجنی سفر کی ابتدا تھی!

کرشن چندر

(تبصرہ)

کرشن چندر اردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں اور ان کی تحریر میں، تخیل میں، قوت تخلیق میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ ان کا دل بہت حساس ہے اور وہ درد اور تکلیف کو نہیں برداشت کر سکتے۔ یہ امر ان کے "صرف ایک آنہ" اور دوسری کہانیوں سے بھی صاف ظاہر ہے۔ ان کی نظر ہر جگہ اور ان کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت ہیں اور کامیاب افسانہ نگار ہیں۔

کرشن چندر واقعیت نگاری کرتے وقت زندگی کے بعض گھناؤنے تجربات کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ "مجھے کتے نے کاٹا" میں غریب کسان اور اس کی بیوی سے جو برتاؤ ہوتا ہے وہ ان کی نظر میں کھب جاتا ہے اور ایسے ہی "صرف ایک آنہ" میں سروش کی بیچارگی اور لوگوں کی بے اعتنائی بھوک اور افلاس اور بے روزگاری کے جو دردناک مناظر کرشن چندر پیش کرتے ہیں وہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے بدنما اور تکلیف دہ پہلو بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ فقط رنگین خواب ہی نہیں دیکھتے۔ ان کی دنیا میں قوس قزح کی سی

دلآویز فضائیں ہی نہیں موجود ہوتیں وہ "کنھیا لال کی شادی" اس کے بے شمار بچے اور اس کی محنت اور بیماری اور آنے والی موت کو بھی اپنی دنیا میں جگہ دیتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں جو متین ظرافت جگہ بہ جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے وہ ان کے طرز بیان میں اور بھی دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ظرافت جہاں کہیں بھی موجود ہے بے ساختہ اور بے تکلف ہے۔

مجموعی طور پر کرشن چندر کے افسانوں کی خصوصیات یہ ہیں۔ رومان اور حقیقت کا ایک دلکش امتزاج، مطالعہ کی باریکی اور فراوانی، موجودہ سماج اور نظام معاشی سے انتہائی دلی نفرت کا جذبہ، طنز و مزاح کی ایک خوشگوار آمیزش، دلکش رمزیہ نگاری اور نفسیات کا عمیق ترین مطالعہ۔

کرشن چندر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ بڑی خوبصورت زبان لکھتے ہیں۔ کرشن چندر کا ۱۹۷۷ء میں انتقال ہوا۔

○

صرف ایک آنہ

سروش، کنگ جارج ڈاکس (KING GEORGE DOCKS) پر گیا۔ وہاں اسے ایک فورمین مل گیا۔ فورمین نے ایک نیلے رنگ کی قمیض اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جس پر جا بجا تیل کے دھبے نظر آ رہے تھے اور اس کی چھوٹی سی ناک پر ایک بہت بڑی عینک تھی۔ یہ ہیئت مجموعی وہ ایک گندہ، بدنما اور رحم دل انسان نظر آتا تھا۔ سروش کو اس کی آنکھوں میں نرمی و ملائمت کی ایک خفیف سی جھلک دکھائی دی۔ پس اس نے فورمین سے ملتے ہی کہہ دیا کہ وہ ایک "بیکار" ہے اور کسی کام کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔

"تم کیا کر سکتے ہو" فورمین نے پوچھا۔

"میں نے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی ہے"۔ سروش نے جلدی سے جواب دیا۔

"بے فائدہ۔ کیا تم بوجھ اٹھا سکتے ہو، بھاری بوجھ"

"نہیں"

"کیا تم کرین (CRANE) پر کام کر سکتے ہو"

"نہیں تو ــــ مگر شاید کر سکوں۔ میرا باپ انجینیر تھا ــــ اور پھر میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔"

فوربین ہنس پڑا۔ تم مجھے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کاش میں تمھاری مدد کر سکتا۔ مگر ہم یہاں تعلیم یافتہ میرا مطلب ہے ہم یہاں ڈگری یافتہ لوگوں کو ملازمت نہیں دیتے۔ وہ عام طور پر کمزور ہوتے ہیں جسمانی کمزوری اور عام طور پر کام کرنے کی صلاحیت بھی ان میں کم ہی ہوتی ہے اور پھر تم تو فن سے بھی بے بہرہ ہو۔ مجھے بہت افسوس ہے لیکن اگر تم ہوڑہ پل پر چلے جاؤ تو شاید کام بن جائے۔ میں نے سنا ہے وہاں تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمت ملتی ہے۔

"کہاں" سروش نے پوچھا

"ہوڑہ پل پر ــــــ کیا تم نے سنا نہیں۔"

سروش ہوڑہ پل پر گیا۔

ایک چھوٹے سے لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے کیبن میں جس کی کھڑکیوں میں سرخ اور سبز رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے ایک یوریشین بیٹھا تھا۔ سروش اس کے قریب بڑھا اور دست سوال دراز کیا۔

"تم جانتے ہو تمھیں یہاں کیا کرنا پڑے گا۔" یوریشین نے اپنی ناک کے نتھنوں کو سہلاتے ہوئے کہا "بہت مشکل کام ہے اور غالباً تم اسے نہ کر سکو گے اور شاید پسند بھی نہ کرو۔"

"کیا کام ہوگا؟" سروش نے پوچھا، "مگر ٹھہرو ــــــ مجھے نہ بتاؤ۔ میں اسے کروں گا۔"

یوریشین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ ہاں تو تین روپے روزانہ اور دن میں صرف دس گھنٹے کام ــــــ وہ رک گیا اور کھڑکی سے باہر ہگلی کے

گدلے پانیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر یک لخت سروش کی جانب مڑا "کیا تم یوریشین ہو؟"

"نہیں"

"آہم۔ میرا بھی یہی خیال تھا"

"کیا تم ایک لوہے کی میخ کو لکڑی کے تختے میں سیدھا گذار سکتے ہو۔" یوریشین نے پوچھا۔

"میں تم سے یہ سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ یہی کام تمھیں اس پل پر کرنا ہوگا میخیں گاڑنا۔ دن بھر لکڑی کے تختوں میں میخیں گاڑتے چلے جانا۔ کیا تم اسے کر سکو گے۔"

"کر سکوں گا۔" سروش نے جواب میں کہا۔ "میرا باپ انجینیر ــــــ

"پچ پچ" یوریشین نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "مجھے تمھارے شجرۂ نسب سے کوئی دلچسپی نہیں" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ پھر سروش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "ساٹھ روپیہ میں یہ کام ہو سکتا ہے یہ کہہ کر پھر اس نے ایک پر معنی انداز میں سروش کی جانب دیکھا۔

سروش نے کمزور لہجے میں جواب دیا "لیکن میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

یوریشین کو غصہ آگیا کہنے لگا "میں کہتا ہوں کیا تم مجھے گاڈ دی تصور کرتے ہوئے میرے پاس ملازمت کی استدعا کرنے آئے ہو۔ کیا میں تمھارا چچا ہوں (میز پر مکہ مار کر) ہم یہاں صرف یوریشین لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں۔ مگر شاید میں اس امر کی بھی پرواہ نہ کرتا۔ کیا ساٹھ روپیہ زیادہ ہیں اور پھر تم تو اس کام سے بھی واقف نہیں ہو۔ کیا تم لوہے کی میخ سیدھی طرح لکڑی کے تختوں میں سے گذار سکتے ہو؟ مجھے شبہ ہے۔ تم میں کئی فنی خامیاں

ہیں۔ کیا تم نے کسی صنعتی درس گاہ میں تعلیم پائی ہے ــــ لیکن میں اسے جانے دیتا صرف ساٹھ روپیوں کے لئے۔ یہ رقم زیادہ نہیں۔ اور جب تم نوکر ہو جاؤ گے اور تین روپے روزانہ مشاہرہ حاصل کرو گے تو یقیناً میرے شکر گذار ہو گے، لو نکالو روپے" یہ کہہ کر پوریشین نے اپنی تقریر ختم کی اور مربیانہ انداز سے سروش کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن ..... لیکن سروش نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا" میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں۔ ایمان سے کہتا ہوں۔

پوریشین نے جواب میں اپنے کندھوں کو ایک اضطراری حرکت دی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سروش نے آہستہ سے کہا" میں تمھیں اپنی تنخواہ سے دو روپیہ یومیہ دینے کو تیار ہوں ــــ اگر"

پوریشین نے اپنے مخصوص اینگلو انڈین لہجہ میں کہا" سب فضول باتیں ہیں"۔ اب وہ ہر ایک لفظ پر زور دے کر فقروں کو ادا کر رہا تھا" ایک دفعہ ..... جس دن تمھارا نام رجسٹر میں درج ہو گیا تم میرے اختیار سے باہر ہو گئے۔ سمجھے؟"

سروش چند لمحے کے لئے خاموش رہا وہ حیران تھا کہ کیا کہے۔ ساٹھ روپیہ کہاں سے لائے کس سے مانگے۔ کون اسے ادھار دے گا۔ اس کے پاس تو کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی جسے وہ گروی رکھ سکتا۔ وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ وہ پھر پوریشین سے ملتجی ہوا۔

"آپ مجھ پر یقین رکھیں" سروش نے نہایت لجاجت سے کہا" میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ....."

مگر پوریشین نے اسے فوراً روک دیا۔ کہنے لگا ــــ" چلو نکلو یہاں سے قسمیں کھاتے

ہو یہ کوئی گرجا گھر نہیں ہے۔"

جب سروش باہر نکلا تو مغرب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ایک دخانی جہاز کی گھنٹی متواتر چیخ چیخ کر جہازراں مزدوروں کو بلا رہی تھی۔ ہگلی کا پانی شعاعوں کے انعکاس سے سرخ تھا۔ سروش کو احساس ہوا جیسے کسی نے آسمان کے مغربی کونے میں سورج کو قتل کر ڈالا ہے اور اب اس کا لہو بہہ کر ہگلی میں آ رہا ہے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کیوں کہ فضا میں بھی موت کا سا سکون تھا اور ایک گرم تعفن بدبو۔ لکڑی کے گیلے تختوں سے اٹھ رہی تھی۔ یکایک پاس کے گھاٹ سے کوؤں کا ایک جھنڈ کرخت آوازیں میں کائیں کائیں کرتا ہوا مغرب کی طرف پرواز کر گیا۔ سروش نے ایک آہ بھری اور یونہی ایک سمت کو چل پڑا۔

سروش نے کوڑا کرکٹ اٹھانے والی کارپوریشن کی لاری کو دیکھا جو ایک بجلی کے پاس کھڑی تھی۔ لاری چلانے والا قریب کی ایک دوکان سے پان خرید رہا تھا۔ دن بھر کا مارا۔ یکایک ایک چھوٹا سا غریب بازاری کتا کہیں سے آنکلا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا، دم دبائے ہوئے لاری کے قریب پہنچا اور پہیوں کو سونگھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ پتلی سی آواز میں چلانے لگا۔ بیچارا غریب کتا شاید کئی دن سے بھوکا تھا اور اب میلے کی لدی ہوئی گاڑی سے ایمونیا کی بو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ اس کے دماغ پر مسلط ہو رہی تھی۔ اس کی اشتہا کی حس کو اذیت پہنچا رہی تھی۔ بھوکے سروش نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے بھنی ہوئی مچھلی کی پلیٹ ہو تو اس کی اشتہا انگیز بو بھی اسی طرح اس کے دماغ کو پریشان کر دے گی۔

کتے کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ پہیوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا: بیچارا لاری کے اوپر تو نہیں چڑھ سکتا تھا۔ شاید وہ عالم تصور میں عمدہ عمدہ پکوانوں کو دیکھ رہا تھا: چربی

ہوئی ہڈی۔ باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے اتنے میں ڈرائیور آگیا۔ پانوں کا پلندہ سنبھالے ہوئے۔ آتے ہی اس نے کتے کی کمر میں زور سے ایک لات جمائی۔ ایک لمبی بلند چیخ جیسے کسی انسان کی ہوتی ہے۔ اگر اسے ایک دو ہنٹر لگا دیئے جائیں بچارا کتا بھاگ نکلا۔ اس کی چھوٹی سی دم پچھلی لاتوں کے درمیان سے گذر کر پیٹ سے جا لگی تھی۔ کتا بھاگتا بھاگتا سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ جدھر سروش کھڑا تھا۔ وہ "چاؤں چاؤں" کر رہا تھا۔ سروش کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر اور اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اپنی چیخیں کم کر دیں۔ پھر دو تین لمبی چیخوں کے بعد وہ چپ ہو گیا اور سروش کے قریب کھڑا ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دم ہلانے لگا۔

یہ جذبۂ امید تھا یا اظہار ہمدردی؟

کتا سروش کے قدموں کے گرد گھومنے لگا جس طرح پہلے وہ لاری کے پہیوں کے گرد گھومتا تھا لیکن اب وہ زیادہ پر امید معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار دم ہلا رہا تھا۔ بار بار زمین سونگھ رہا تھا۔ پھر یکایک کھڑا ہو گیا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سروش کے چہرے پر جما دیں اور دم ہلانے لگا۔

"ایک بسکٹ کھاؤ گے۔ بسکٹ"؟

یہ سروش کا آخری بسکٹ تھا۔ اس نے اسے جیب سے نکال لیا کتنا خشک اور کرارا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے کتے نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ چھوٹی چھوٹی چیخیں مارتا ہوا خوشی سے سروش کے گرد اچھل رہا تھا اور زور زور سے دم ہلا رہا تھا..... آخر سروش کو وہ بسکٹ دینا ہی پڑا۔ کتے نے ایک لمحہ میں اسے حلق کے نیچے اتار لیا۔ ایک لمحہ بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ سروش شاید کتے کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھ رہا تھا ایک بھوکا آدمی تھا اور ایک بھوکا کتا۔ اور اب دونوں سڑک کے کنارے چپ چاپ مغموم کھڑے تھے

جیسے دنیا سے باہر نکال دیئے گئے ہیں۔

ایک لمبے وقفہ کے بعد سروش نے سر جھکایا۔ اور ایک طرف کو چل پڑا۔ کتا آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

وہ رات اس نے سیالدہ اسٹیشن پر بسر کی۔ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم کا پختہ فرش جس پر سیمنٹ لگا ہوا تھا سخت اور ٹھنڈا تھا۔ اسے مشکل ہی سے ویٹنگ روم کہا جا سکتا تھا کیوں کہ یہ ایک کمرہ تو نہ تھا بلکہ محض ایک برآمدہ سا تھا۔ تین اطراف سے کھلا اور چھت پر ٹین کے پرانے تختے اور چھت کے نیچے کہیں کہیں لوہے کے کھمبے تاکہ چھت کا سہارا رہے اور گر نہ پائے۔ سروش اس برآمدہ سے باہر سیاہ آسمان پر انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ سکتا تھا اور وہاں ایک پیلا سا مٹیالی رنگت کا چاند بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ چاند ایک پکے ہوئے ولایتی کیک کے مانند تھا جو ابھی ابھی انگیٹھی سے باہر نکالا گیا ہو۔ سروش نے اسے دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر لیں ہاں وہ تھکا ہوا تھا۔ اور بھوکا تھا دن بھر وہ میلوں چلتا رہا اور کلکتے کی گلیوں، اس کے شاندار بازاروں اور پرشکوہ چوکوں میں گھومتا رہا تھا۔ وہ ایک پاگل آدمی کی طرح چکر کاٹتا رہا۔ اس دیوانے کی طرح جو محض اپنے پیٹ کے لئے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن اسے نوکری کہیں نہ ملی۔ اسے نوکری کیوں نہ ملتی تھی۔ کیوں لوگ اس کے غربت زدہ چہرے کو دیکھ کر چڑ جاتے تھے۔ جیسے کسی چیز نے انھیں شرمندہ کر دیا ہو۔ لیکن کیوں؟ مگر اب سروش کو ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ وہ آج بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا دماغ کام کرنے سے رک گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید اس کے دھڑ کے ساتھ ٹانگیں نہیں ہیں بے حد تکان تھی جیسے شراب کا نشہ ہو۔ پھر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اندر داخل ہو کر اس کے جسم کی ہڈیاں

توڑ رہا ہو۔ اس کے معدے کو مٹھی میں دبا کر زور سے بھینچ رہا ہے۔ اس کے ماتھے پر تیز تیز سوئیاں چبھو رہا ہے۔ آہ ..... اس نے اپنی ٹانگیں فرش پر پسار دیں اور بازو پھیلا دئے۔ ہاں سیمنٹ کا فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ اسے تھوڑا سا سکون حاصل ہونے لگا تکان سے اینٹھے ہوئے اعضا آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اب اسے اگر کہیں سے تھوڑی سی روٹی مل جاتی۔ بس ایک دو ٹکڑے ؟ بیوقوف ــــ اس نے اپنا بسکٹ کتے کو کیوں دے ڈالا ..... سروش آہستہ آہستہ اپنے ننگے بازوؤں کو فرش پر پھیلانے لگا۔ ہاں فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ ٹھنڈا۔ صاف اور خشک۔ گلی یا سڑک کے فٹ پاتھ کی طرح نم دار اور گرد آلود نہیں تھا۔ مجھے آئندہ یہاں ہی سونا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا۔ یہ جگہ اس وقت تو کافی ویران دکھائی دیتی ہے اور پھر یہاں کوئی پولیس کا سپاہی بھی نظر نہیں آتا ہے اور کسی بھلے مانس نے بجلی کا بلب بھی توڑ دیا ہے۔ یکایک اس کا ہاتھ کسی نرم و گرم شے سے ٹکرایا۔ یہ ایک ہاتھ تھا یونہی غیر شعوری طور پر ہی اس نے اس کی انگلیوں کو چھوا۔ پھر اس کی ہتھیلی کو پھر کلائی۔ اس کے بعد اس کی انگلیاں ایک کانچ کی چوڑی پر جا کر رک گئیں۔ سروش نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے نزدیک ایک کونے میں ایک عورت گھٹنے سمیٹے ہوئے لیٹی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس کا سیاہ بازو نرم اور گداز تھا۔ اس کی دھیمی سانس باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ یک لخت پلٹ کر وہ اس کے پہلو کی طرف مڑ گیا۔

"تم کون ہو" عورت نے ایک مدھم مغموم لہجے میں پوچھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک مرتبہ سروش کی طرف دیکھا پھر انھیں بند کر لیا۔ وہ ایک غریب بھیک مانگنے والی عورت تھی۔ وہ غریب تھی اور بدصورت اور بے حد تھکی ہوئی۔ اسے کس کی پروا ہو سکتی تھی۔

صبح کے دھندلکے میں پولیس کے ایک سپاہی نے ٹھوکر سے سروش کو جگا دیا اور دھکا دے کر ویٹنگ روم سے باہر نکال دیا۔ عورت سروش سے پہلے ہی کہیں جا چکی تھی خدا جانے کدھر۔

"دوسری مرتبہ اگر میں نے تمھیں یہاں سوئے ہوئے دیکھا" پولیس کا سپاہی کہہ رہا تھا "تو تمھیں سیدھا جیل خانے پہنچا کر چھوڑوں گا۔ حرام زادہ کہیں کا، سور کا بچہ ..... نکل یہاں سے ....." سروش آنکھیں ملتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ سپاہی کی گالیوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کیسی اچھی رات تھی۔ اور وہاں اس مہربان بھیک مانگنے والی عورت نے اسے کتنا آرام دیا تھا۔ ایک لمبے سے چیتھڑے میں جسے وہ اپنے سر کے نیچے دبائے ہوئے تھی بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں بندھی تھیں۔ چند کھجوریں ایک ناریل اور ایک پوری روٹی ..... اب وہ کہاں تھی؟ کیا وہ اسے پہچان سکے گا۔ مہربان بھکارن۔

یکایک کسی نے اسے دھکا دیا۔ کیا تمھاری آنکھیں ..... کیا ..... کیا تم اندھے ہو گئے ہو۔ ایک موٹا کہہ رہا تھا۔ راستہ دیکھ کر نہیں چلتے سر پر چڑھتے آتے ہو۔ ..... بھک منگے۔ بدمعاش۔ اسی طرح گالیاں دیتا ہوا موٹا بابو آگے نکل گیا۔

لیکن شاید سروش نے اسے نہیں سنا۔ وہ بہت دور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھا۔ اور ساری کائنات اس کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر واپس بھاگ رہی تھی۔ اس نے سوچا کتنا ہی اچھا ہو اگر وہ ایک بھکاری بن جائے۔ اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اب تو لوگ یوں بھی اسے بھک منگا سمجھتے ہیں اور پھر بھک منگے انسانوں سے زیادہ رحم دل ہوتے ہیں۔

منگتو، بھکاریوں کا سردار لاتیں پھیلائے چٹائی پر حقہ پی رہا تھا۔ اس کی توند موٹی تھی اور داڑھی سفید۔ اس نے سروش کو کھلے گلے اور لمبے کالروں والی ململ کی قمیص دی اور نیلی سرج کا کوٹ جس پر تیل کے بڑے بڑے دھبے تھے اور ایک گہرے فلالین کی پتلون اور ایک چمڑے کا بیگ۔ یہ لو بیٹا۔ منگتو نے کہا۔ ان کپڑوں کو پہن لو اور اس بیگ کو ہاتھ میں تھامے رکھو۔ دیکھو اس بیگ میں کیا ہے۔ اس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ایک پرانی قمیص۔ ایک دانت صاف کرنے والا برش۔ ایک پرانا استرہ زنگ آلود اور گھسے ہوئے صابن کی ڈبیہ بس یہی تمہارے ہتھیار ہیں یہی تمہاری دوکان ہے۔ ان سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرو۔ تم کہتے ہو کہ کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو۔ میں اس بات کا بغیر سرٹیفکیٹ دیکھے یقین کر لیتا ہوں۔ ہمارے ٹولے میں کئی دسویں پاس بھکاری ہیں لیکن تم پہلے گریجویٹ بھکاری ہو جیسا میں نے شروع میں کہا۔ مجھے تم پر اعتماد ہے تمہاری لیاقت پر، تمہاری دانائی پر، مجھے امید ہے کہ تم ہمارے پیشہ کے لئے باعث فخر ہو گے۔ اب اسی پیشہ کو پکڑ لو۔ ہمیشہ کے لئے اور اپنی ان تمام چالاکیوں کو کام میں لاؤ جو تم نے زمانہ تعلیم میں حاصل کی ہیں۔ اگر تم ہوشیار رہے تو ایک دن میری جگہ حاصل کر لو گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ انگریزی سلطنت میں جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا وسعت اور آبادی کے لحاظ سے دوسرا شہر ہے۔ میں نہیں جانتا یہ سچ بھی ہے کہ نہیں لیکن اگر ایسا ہو تو کالی ماتا تمہیں توفیق دیں کہ تم ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو۔ لو بیٹا۔ منگتو نے اپنی تقریر ختم کی اور پھر چند دقفوں کے لئے رک گیا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر اس نے چٹائی کے قریب پڑے ہوئے بوٹوں کے ایک جوڑے کو اٹھا لیا اور سروش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا ہاں بیٹا میں تو انہیں بالکل ہی بھول گیا تھا۔ انھیں بھی

پہن لو۔

سروش چٹائی پر بیٹھ کر انھیں پہننے لگا۔ بہت پرانے بوٹ تھے سوکھا ہوا چمڑہ کرم خوردہ بے رنگ و بدنما۔ یکایک سروش کی نگاہیں ایک سبز لیبل پر پڑیں جو بوٹ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سروش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں برچھی بھونک دی ہو۔ یہ ایٹونیا مارکہ بوٹ تھا۔ وہی پرانا سبز لیبل۔ انھیں بوٹوں کو وہ ہمیشہ کالج کے دنوں میں جانسن اینڈ کو کی دوکان سے خریدا کرتا تھا۔ شاید قسمت کی وحشیانہ بے رحمی تھی۔ کوئی اس کے دل کو مسوس رہا تھا۔ یکایک اس کا گلا بند ہونے لگا۔ کوئی غیر مرئی طاقت اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کے گلے کو دبا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس وقت نہ بول سکا تو پھر شاید ہمیشہ کے لئے چپ ہو جائے گا۔ مر جائے گا۔ اس نے بازوؤں سے ہوا میں کسی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے منہ کھول کر ہوا کے ایک دو گھونٹ نیچے اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے بولنا چاہا اور پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ایک بلند وحشیانہ چیخ یا ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹ نکلی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بند بند ہنسی سے کانپ رہا تھا۔

"مت ہنسو" منگتو نے کانپتے ہوئے کہا.....

سروش چیختا گیا یا شاید ہنستا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے گئے۔ تیز و ترش آنسو جو انگاروں کی طرح گرم تھے جو اس کے خشک رو کھے رخساروں کو جن پر داڑھی بڑھی ہوئی تھی سیراب کر رہے تھے۔ اور اس کی لمبے لمبے کالروں والی ململ کی قمیص کو تر کر رہے تھے۔ یکایک اس نے چمڑے کی بیگ کو ہاتھ میں تھام لیا اور تیزی سے بھاگ گیا۔

اس دن دوپہر کی دھوپ میں چترنجن ایوی نیو کے پاس مان سنگھ ٹیکسی ڈرائیور کو ایک پولیس سارجنٹ نے روک لیا۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ جس میں ایک آدمی ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی لاری سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔ مان سنگھ نے دیکھا کہ سڑک کے درمیان لہو سے سرخ جگہ پر ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ وہ ایک پرانا نیلا کوٹ پہنے تھا اور اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ پولیس سارجنٹ دونوں نے مان سنگھ کو مدد کے لئے کہا۔ مان سنگھ اور پولیس سارجنٹ دونوں نے مل کر اس آدمی کو ٹیکسی میں لٹا دیا۔ جب مان سنگھ نے بے ہوش آدمی کا جسم ایک لمبی سیٹ پر رکھا اور اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو ٹھیک کیا تو اس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی گھٹی ہوئی ہتھیلی میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دبی پڑی ہے۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا یہ 'ایک آنہ تھا!'

سعادت حسن منٹو

(تبصرہ)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں میں جنسی مسائل نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ بہت کچھ فرائڈ کے فلسفہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کو ان ہی افراد سے دلچسپی ہے جو اپنی عزت اور اپنے جسم کو فروخت کر چکے ہیں۔ انھوں نے ان کی زندگی کے حالات کو بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ ان کے بیان میں حد درجہ کی بے باکی ہے۔

طوائفوں یا اس طبقہ کے دوسرے کرداروں کو وہ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی ہی ان لوگوں میں گزری ہو۔ جنسی کیفیت اور نفسانی خواہشات کے مظاہرے بڑی تفصیل اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں۔

منٹو کے اسلوب بیان میں کافی روانی ہے۔ سادگی بہت ہے مگر گہرائی بالکل نہیں۔ موضوع میں کبھی جدت نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کی بات زیادہ تر کہتے ہیں۔ البتہ نفسیات کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے۔ متحرک کرنے والے جذبات یا متحرک ہونے والے

اثرات کو بڑی اچھی طرح پیش کرتے ہیں۔

فنی اعتبار سے منٹو کے افسانوں کو اردو ادب میں بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

○

خودکشی

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا۔ اس کے زہد و تقویٰ کے سبھی قائل تھے۔ اس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے۔ شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اس سے اس کو بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی یعنی ویسے ہی حسین و جمیل۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ ان پر لمبی پلکیں۔ مہین ابرو۔ چھوٹا سا لب و دہن۔ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کئے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ زاہد خود بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لئے منتخب کرتا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا اتنی جلدی کیا ہے ـــــ نام رکھ لیا جائے گا۔

بیوی مصر تھی کہ نام رکھ لیا جائے۔ میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ کہتا اس میں کیا ہرج ہے۔ جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گل گوتھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے۔

بر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں۔ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

فی الحال بیٹا کہہ دینا کافی ہے۔

یہ کافی نہیں ہے۔ میری بیٹا کا کوئی نام ہونا چاہئے۔

تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔

یہ کام آپ کا ہے۔ میرا نہیں۔

تو تھوڑے دن انتظار کرو۔ میں اردو کی لغت لاتا ہوں۔ اس کو پہلے صفحہ سے آخری صفحہ تک غور سے دیکھوں گا۔ یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔

میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔

نہیں میری جان ـــــ نکالتے ہیں ـــــ میرا ایک دوست ہے اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اردو کی لغت نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔

"کیا نام تھا؟"

نکہت۔

اس کے معنی کیا ہیں؟

خوشبو۔

بڑا اچھا نام ہے ـــــ نکہت ـــــ یعنی خوشبو۔

تو یہی نام رکھ لو۔

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا "نہیں ـــــ میں اپنی بٹیا کے لئے پرانا نام نہیں چاہتی۔ کوئی نیا نام تلاش کیجئے ـــــ جائیے ڈکشنری لے آئیے۔

زاہد مسکرایا ـــــ لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی "میرا پرس الماری میں پڑا ہے اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئے نکال لیجئے۔

"زاہد نے بہت بہتر" کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خریدے۔

وہ کئی کتب فروشوں کی دوکانوں پر گیا۔ کئی لغت دیکھیں بعض تو بہت قیمتی تھیں کچھ بڑی ناقص۔ آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی۔ خرید لیا اور راستے میں اس کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گذر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اسے اپنے بوٹوں کی دوکان میں لے گیا وہاں اسے تقریباً ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا۔ کیوں کہ بہت دیر کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے دوست کو دوران گفتگو میں پتا چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا یہ اس بچی کو دے دینا۔ کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں ـــــ نام کیا رکھا ہے اس کا۔

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی —— ابھی تک کوئی اچھا نام سوجھا نہیں۔ اس کے دوست نے جوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا —— یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے "شمینہ ہے، شاہینہ ہے، نسرین ہے الماس ہے۔"

زاہد نے جواب دیا "یہ سب بکواس ہے۔"

اس کے دوست نے جوتا ڈبے میں رکھا "تو اب جو بکواس تم کرو گے وہ بھی ہم سن لیں گے۔" اس کے بعد اٹھ کر اس نے زاہد کو گلے سے لگایا۔ خدا اس کی عمر دراز کرے —— نام ہو نہ ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

زاہد جب دوکان سے باہر نکلا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیراتی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے۔ عیدن کیا بلا ہے ——

اس کے جی میں آیا کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے "میری جان نام میں کچھ نہیں رکھا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو۔"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا لیکن معلوم نہیں اس کا دل غیر معمولی طور دھڑ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے —— تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی طبیعت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔

—— بغل میں لغت تھی —— اس کو اس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کیا مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بری طرح ہانپنے لگا۔ اور ایک دوکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں

ایک خالی تانگہ آیا اس نے اس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا "چلو مزنگ لے چلو" لیکن جلدی پہنچاؤ مجھے وہاں۔ ایک بڑا ضروری کام ہے۔

مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا۔ یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا گیا آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اتار دیا —— ہائی کورٹ کے قریب اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہیں کیا۔

زاہد اور زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ تک پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں وہ دروازہ کے پاس رک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی —— "مشکل ہی سے بچے گی بچی —— تشنج کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں ——

زاہد ان عورتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا اور اس کمرہ میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر جاتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چیخ سنی۔

اس کی بٹیا دم توڑ چکی تھی اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں۔ اور زاہد کو اس کمرے سے نکال دیا۔

سعادت حسن منٹو

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی وہ ایک ڈاکٹر لے آیا اس نے زاہد کی بیوی کو دو ایک انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں معطل ہو چکی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے۔ خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ساتھ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی سے تیار کرائی گئی تھی اس میں خود اس نے اسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت بھی رکھ دی۔

لوگوں نے سمجھا ــــ قرآن مجید ہے۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مردوں کے ساتھ قرآن کو دفن کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے۔ لیکن اس میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا.....

بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو اس کی بیوی کو بہت تیز بخار تھا۔ سرسام کی کیفیت ہے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا۔ اور زاہد سے کہا حالت بہت نازک ہے۔ میں علاج تجویز کئے دیتا ہوں۔ لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے۔ لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا "کیا تکلیف ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "بہت سی تکلیفیں ہیں"۔ ایک تو یہ انھیں بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ تیسرے یہ کہ انھیں ایک سوڈگری کا بخار ہے۔

ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کئے۔ دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔ زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے بھی لے آیا۔ دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں۔ لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا سا ہوش آیا۔ نڈھال کیفیت بھی دور ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی پیاری حسین بیوی نے اسے بلایا اور بڑی نحیف آواز میں کہا "میرا آخری وقت آگیا ہے ــــ میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں"۔

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ تمھیں خدانخواستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا۔

اس کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ــــ میں مر گئی کل دوسری آجائے گی"۔ "خدا آپ کی عمر دراز کرے ــــ اور ــــ اور ــــ

اس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی۔

زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رخ کیا۔

رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آرہی تھی وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پٹڑی پر لیٹ جائے اور اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئے گی تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں ــــ یہ جتنی جلدی مختصر ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اور اب زیادہ صدمے نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر

ہوتی ہے دکھائی دی۔ لیکن ابھی وہ دور تھی۔ اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آگئی ـــــ زاہد آگے بڑھا۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہوگیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے آرہی تھی اور قریب تھا کہ وہ آدمی اس کی جھپٹ میں آجائے وہ تیزی سے لپکا اور اس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اس طرف گرا دیا ـــــ گاڑی دندناتی ہوئی گذر گئی۔ اس آدمی سے زاہد نے کہا "کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے" ـــــ اس نے جواب دیا "جی ہاں"۔

کیوں؟

"بس ـــــ صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا"

زاہد ناصح بن گیا "بھائی میرے۔ زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو۔ خودکشی بڑی بزدلی ہے۔ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اٹھو اپنے صدموں کو بھول جاؤ ـــــ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو وہ خوشیوں سے کیا حظ اٹھائے گا ـــــ چلو میرے ساتھ"۔

راجندر سنگھ بیدی

(تبصرہ)

یہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور خاندان سکھ سے تعلق رکھتے ہیں تعلیم بہت معمولی ہے۔ صرف ہائی اسکول تک پڑھا ہے۔ کرشن چندر کے قول کے مطابق "ان کا بہت سا وقت ڈاک خانہ کی نوکری میں برباد ہوا لیکن پھر بھی افسانہ نگاری کا فطری جوہر جو قدرت کی طرف سے اس کو ملا تھا اس زمانہ میں بہت لوگوں سے داد تحسین لے چکا تھا۔ اور اس کے دوستوں اور جاننے والوں کو اس سے بڑی امیدیں تھیں"۔ لیکن بیدی خود اپنی فطری صلاحیتوں سے ناواقف تھا اور اس کے اندر بڑی حد تک احساس کمتری موجود تھا اور یہ اسی وقت دور ہوا جب اس نے ڈاکخانہ کی کلرکی چھوڑی اور خالص افسانوی دنیا کے وسیع میدان میں اپنے قدم رکھے اور اپنا صحیح مقام پالیا۔

بیدی کا احساس بڑا تیز ہے۔ اس میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کو ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے دلی لگاؤ ہے۔ ان سے اس کو بڑی ہمدردی ہے۔ ان کی وہ ہر طرح سے مدد کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں وہ ان کا نمائندہ ہے۔ اس میں ذہانت بلا کی ہے اس کو لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے بڑا شغف ہے۔ چنانچہ مزاح

اس کے افسانوں کی جان ہے۔

اس نے بہت سے افسانے لکھے جن میں "گرہن" بہت مشہور و معروف افسانہ ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ہماری زندگی کی پوری تصویر پیش کر دیتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بہت تیز نگاہ میں دور رس اور دور بینی ہے وہ زندگی کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑتا اور معمولی باتوں کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ نفسیات کا بھی ماہر ہے۔ اس کے یہاں پلاٹ اور کردار نگاری کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خلوص اور سچائی اس کے یہاں کی اہم خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے اس میں زور اور اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے موجودہ دور میں وہ ایک بڑا افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔

○

گرہن

روپو، شبو، کنتھو اور منا ——— ہولی نے اساڑھی کے کالیستھوں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چندرہی مہینے میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں لچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میاں پیارے چاندرانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا، گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ کپڑا پھاڑ سکے۔ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے۔ وہ سی نہ سکتی تھی۔ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی۔ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرہ پر لکھے جائیں گے اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا۔ لیکن اب سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل دور کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھول

بندر پر شام کے وقت اسٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے کے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے ہیں۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا، برتن کے کام سے فارغ ہوتا تھا۔ منیا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینا چاہئے، ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے، گویا وہ بدزیب فراخ نتھنوں والی ہٹیلی منیا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع تھی۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل کنبہ اور اکیلی ہولی۔ دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی۔ پھر جانوروں کے لئے بنولے کھلی اور چنے بھگوتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کے کولھے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر منیا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچہ کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی منیا اور کایستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی.........

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے وہ اپنے باپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ دیوگرام کا ایک متمول ساہوکار تھا۔ اور سارنگ دیوگرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے اس کے باوجود اسے کایستھوں کے یہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کایستھوں کو تو بچے چاہئیں ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کایستھ ہی کُل دودھو (کُل کو بڑھانے والی

بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچہ کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اس لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ ہے۔

"دیور ہے تو الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی تھی۔ اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں زیادہ برے ہیں اور بڑے کایستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کون سا حق ہے؟ —— رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا —— لیکن یہ شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں اور منیا کی تو بات ہی علیحدہ ہے۔ شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنے ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عاید کرتی.......؟

راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں اس کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں۔ اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں —— اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے —— ایک کالا سا راکشس شیر پر چڑھا ہوا دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی شکل سے راہو دکھائی دیتا ہے۔ منا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی کہ آ موجود ہوا —— کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی جھلک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ اور جلدی سے توے کو دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میا آئی اور آتے ہی بولی۔

"ہو ـــــ اناج رکھا ہے کیا؟

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی ـــــ ہاں ہاں ـــــ رکھا ہے؟ نہیں رکھا یاد آیا۔ بھول گئی تھی میا؟

تو بیٹھی کیا کر رہی ہے نباب جادی؟ (نواب زادی)

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی "جی مجھ سے اناج کی بوری ہلائی نہیں جاتی۔"

میا لاجواب ہو گئی اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی "تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری .....؟ رانڈ جانتی بھی ہے۔ آج گہن ہے جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیری ایسی ایسوا اسے پالنے چلے گی۔"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہو جائے لیکن رانڈ کی گالی اس کے بس سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتا دیکھ کر میا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سرمہ پیسنے کا

کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے پرہوش نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔

اس وقت میا ماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بد سلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا البتہ میا کی اس عادت سے جل بھن گئی۔

ہولی سوچتی تھی کہ کل رسیلے نے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے اس کی بات کا جواب دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے ناراض کیوں ہے۔ کیوں گالیاں دیتا ہے۔ میرے کھانے پکانے، اٹھنے بیٹھنے میں اسے سلیقہ کیوں نہیں دکھائی دیتا۔ اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے۔ اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ مرد .....

میا نے کچھ باسمتی، دالیں، نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا یہ میا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باسمتی چاول پیندے میں چمٹ گئے تو بہو مرتی کرتی پھوہڑ ہو گئی۔ اور آپ اتنی سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی

"لے دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی تھی کہ بچاری وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے، بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔

اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہو گا: بچہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح چرمرسا پیدا ہو گا۔ اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا برا سا چہرہ دیکھ کر اسے

کو سا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ لیکن قصور اور بے قصوری کی بات تو علیحدہ ہے کیوں کہ یہ سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا کیا گناہ ہے ـــــ سب گناہ ہولی کا ہے؟ ـــــ

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آگیا۔ سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تر دیدی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول ناریل، بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منھ کھولے ہوئے آتی ہے اور پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان کے گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور بہت دور ـــــ ایک نامعلوم ـــــ ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے۔ ایک سال بعد لوگوں کے بدن پھر گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں پھر گنہا جاتے ہیں پھر دیا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک وصاف ـــــ

جب گرہن شروع ہو جاتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جمگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے ہی والا تھا۔ ہولی نے بچوں کو کاستھوں کے پاس چھوڑا ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندہ کی طرف اشنان کے

لئے چل۔

اب میاں رسیلا بڑا لڑکا شبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں مالا کے علاوہ مشک کافور بھی تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی۔ تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی ـــــ کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے۔

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل دور ایک لائچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے میں کشمکش کے خلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لائچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی اس کے بعد چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسّے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے اسٹیمر لائچ کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ دیو گرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں گے... ..... اور پھر وہی اماں ـــــ

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منھ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آپڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑ لی۔ اب گھاٹ آچکا تھا۔ مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں ـــــ فقط چند گھنٹوں کے لئے.....

اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار بعید الفہم طاقت ہے۔ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی۔ آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں ـــــ سارنگ ریوگرام کے سامنے۔ وہ کلس۔ مندر کے گھنٹوں کی آواز، لانچ کی سیٹی اور ہولی کو یاد آیا اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے کبھی نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا۔ اور ٹکٹ مانگنے لگا۔ پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا۔

مرغی ـــــ دو لے ـــــ چابیاں میرے پاس ہیں ـــــ پانی زیادہ ہوگا ـــــ

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے۔ اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا عین جب کہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی۔ ہولی کی امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا۔

میکے کے رشتہ سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا۔

اور سابرمتی پھاند کر کسی نہ معلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا رہتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز ہی سے پہچان لیا اور کچھ

دلیری سے بولی۔

"کتھورام"

"کتھورام نے بھی سیتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی" بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا۔"

کتھورام بولا "ہولے"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کتھو بھیا.....

مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو۔ کتھورام قریب آیا اور ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا "سارنگ دیو جاؤ گی ہولے" اور پھر سامنے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی"

ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا "بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ کے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا۔

"ہولے کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو"

"ہاں"

"یہ سریچھ جادیوں کا کام ہے؟..... اور جو میں کایستھوں کو خبر کر دوں تو ہولی ڈر سے کانپنے لگی وہ نہ تو نواب زادی تھی اور نہ سریچھ جادی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کتھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے

سامنے لانچ کے رسّے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیوگرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کتھورام بولا "ہولے۔ ڈرو نہیں ہم تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کرلو۔

کتھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کتھورام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

کتھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری بیٹی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا۔ اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی کتھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کتھورام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔

سمندر کی ایک بڑی اچھال آئی سب پھول بتاشے آم کی ٹہنیاں گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لے گئی ـــــ دور بہت دور ایک نامعلوم ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر کی طرف

جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی ـــــ پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے ایک عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ بگٹٹ۔ وہ گرتی تھی بھاگتی تھی ـــــ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہانپتی اور دوڑنے لگتی اس وقت چاند آسمان پر پورا گہنا چکا تھا ـــــ راہو اور کیتو نے جی بھر قرضہ وصول کرلیا تھا۔ وہ دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے ـــــ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھی۔

دان کا وقت ہے.........

چھوڑ دو............. چھوڑ دو...........................

چھوڑ دو..........

ہر پھول بندر سے آواز آتی

پکڑ لو............پکڑ لو...................پکڑ لو..............

....

چھوڑ دو............ دان کا وقت ہے.........................

......پکڑ لو................ چھوڑ دو..................................

عصمت چغتائی

(تبصرہ)

عصمت چغتائی مرزا عظیم بیگ چغتائی کی بہن اور سعادت حسن منٹو کی ساتھیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بھی جنسیات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ اس فن میں اپنے بھائی سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی ہیں۔ انھوں نے متوسط طبقہ کے نوجوان لڑکیوں کی ان دبی ہوئی خواہشات کی ترجمانی کی ہے جن کو ان سے پہلے کسی دوسرے نے اس طرح پیش کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ان کے یہاں بے ساختگی، ازخود رفتگی بے باکی شگفتگی پائی جاتی ہے اور یہی ایسی خوبیاں ہیں جو ایک افسانہ نگار کو کامیاب ادیب بنا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ بے ساختگی و ازخود رفتگی میں خلوص و ہمدردی ہو اور بے باکی مذاق سلیم پر بار نہ ہو۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

ان کے یہاں عریانیت حد سے زیادہ پائی جاتی ہے اور اس سے سماج کا اکثر حصہ نالاں ہے اور اس عریانیت میں جس کو حقیقت نگاری کہا جاتا ہے افادیت کا دور دور نام و نشان نہیں۔

انھوں نے ہر عمر کی عورتوں کی بڑی کامیاب مصوری کی ہے۔ ان کے یہاں کردار نگاری بھی اچھی ہے۔ زبان مکالمے روزمرہ بول چال کے محاورے بھی بڑی خوبی سے استعمال کئے گئے

ہیں اسلوب میں بھی زور اور جوش پایا جاتا ہے۔

ان کے افسانوں کی کثیر تعداد ہے۔ جن میں بھول بھلیاں، جوانی، چوٹیں، ایک بات، لحاف وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے تو بہت اچھے ہیں۔ آل احمد سرور نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"یہ ہر شیرینی میں تلخی ملا دیتی ہے اور حسین خواب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اور اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اس تخریب سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔"

اگر وہ اپنی آزادی، بے باکی اور حقیقت نگاری کو اخلاق کے حدود میں رکھتیں تو بڑی کامیاب اور معزز افسانہ نگاروں میں شمار کی جاتیں اور ان کی صلاحیتوں سے اردو ادب اور سماج کو فائدۂ عظیم ہوتا۔

○

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو، اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے۔ مگر سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے۔ کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ

جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی۔ کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھنٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتی۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جب ہی دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ ننگا سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جھنجھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس ابھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوری رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں۔ اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے لال لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زرد

مائل مٹیلے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پوے پوے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ــــــ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے شبنمی دوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طوطی کے پچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی بارات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چائے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گھونٹ تو اتر آئے گی پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بولو اور سنو تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟"

اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی منچلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی۔ بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک

کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیوتوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن سے لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے روز سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بچتی تو تلے دانی یا شیشے کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم سے اپنے ابا یاد آگئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا کیا سوچا کرتے پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں

چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا اس کے ننھے سے غصّے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں پھر بی اماں آکر انھیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھّو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابّا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے۔ اوپر سے چکنائی بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا۔" ابّا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقہ کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا ہے جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناونی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں۔ نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے۔ اور

نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی دیسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنا چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے بچّہ کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شب برات کے مہینے میں کریب کا دوپٹہ خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گذارہ نہ تھا منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو ایک دم جیسے گھبراہٹ کا دورا پڑ گیا۔ جانوں چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ:

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی

ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشے کی لونگیں اتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پوچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبری نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالحہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے۔ دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ میرے اللہ میاں اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت میاں آئے تو کبری پہلے ہی سے مچھر دانی کو کھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبری کوٹھری سے اٹھی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں!" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹہ میں لپٹا نکتی رہیں جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب

بھی چل دی۔ اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو نچلے ماموں نے رنڈ پا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے۔ کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی"

وہ حمیدہ کو منھ پھلائے ہوئے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی، ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے نہار منھ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے، دودھ اوٹتا ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے، اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا۔ اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا، پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا۔ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی یہ تو طعنہ دینے والیوں کے منھ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیان اور ناک سے تھتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیہ کے غلاف پر سویٹ ڈریم کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں

کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں" ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے کچھ آنکھوں سے۔" "اے نوج خدا نہ کرے" میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔"

بی اماں فخر سے کہتیں:

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے" بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں یہ چھوٹی نگوڑی بکریہ کون کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں" اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت کوئی ہنسی مذاق، اونہہ، اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو مگر.........." میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔

بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں:

"دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خاص آنکھیں ہیں۔

"جا نگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی برات کا غبار تھا۔ اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھل کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ

"واہ جی واہ دولہا بھائی! کھل کے کباب کھا رہے ہو" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے بلا لیا۔ اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتلائیے نا"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹوکا دیا۔

"آپ نے لاکر دئے اور ہم نے کھائے مزے دار ہی ہونگے۔"

"ارے واہ رے جنگلی" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمھیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا۔"

بی اماں کا منھ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات تو نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی پکتے پراٹھے ٹھسائیں، میری بی آپا کو جو شاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی لنگلوائیں میں بھنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منھ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گذارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں بی اماں تو چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں بات بے بات چھیڑنا، کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا ہے کسی دن صاف کہہ دوں کہ کس

کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔

اے بی مجھ سے تمھارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ..... نہیں..... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دئے۔ ناس جائے اس کمبخت نرے کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔

"اونہہ!" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے" بی آپا نے شرم اور حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منھ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں..... اوہ نہیں..... کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالا پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں، بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں ان کی بے گار کب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا۔ کیا ان میں کبھی مہندی نہ

رہے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو .... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ ...."

"اری چپ مردار!" انھوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں آپا انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھری ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے مٹی کے تودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے انھیں پیانوں پر رقص کرنا نہ سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دئیے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں۔ بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

"وہ بولے؟" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا:

"بی آپا یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

کیوں" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے .... دیکھئے میری چوڑیاں چورہ ہو گئیں" میں نے کلنتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا .... سنو بی آپا یہ راحت اچھے آدمی نہیں ہیں" میں نے سلگ کر کہا ـــــ "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں!"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہے کہ ہاتھوں لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں: "خیر تو بھی چوتھی میں بدلا لیجیو، وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔ اور معاملات کو امید افزا راستے پہ گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو ممیری بہنوں کی شادی کرائی۔ جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں۔ لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے۔ کیا مجال وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے یہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم پندرہ تولہ سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولہ سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بینگن نہیں اچھا خاصہ پہاڑ ہے جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارے پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں، کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منھ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کے گھر سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلہ ٹولہ کی لڑکیاں صحن میں ادھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں وہ بھی نکل جائیں گی آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اترا تھا

تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدہ کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ گرم کیا ملیدہ مراد بر لائے گا میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منھ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے۔ جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے........

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی شرم سے نڈھال آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں.......... چوتھی کا زر دار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح الجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے حمیدہ کا گلا بھر آیا..........

"جاؤ میری بہنو۔" بی آپا نے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ........ یہ ملیدہ" اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے

کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا.....! اور منہ کھول دیا وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا.....

نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدہ کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری۔ اور لالٹین نے زمین پر گر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں شگل کشائی کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ باہیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان

جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتہ کیا۔ اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں مینا ؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ جمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جاتی۔ لال ٹول پر..... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے

بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے گرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

ہمارے مطبوعات

ناول و افسانے

چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	۳۰/۰۰
روشنی کی رفتار	″	۳۰/۰۰
آخرِ شب کے ہمسفر (ناول)	″	۵۰/۰۰
ایک دن بیت گیا (ناول)	صلاح الدین پرویز	۴۰/۰۰
سارے دن کا تھکا ہوا پرش (ناول)	″	۳۰/۰۰
چوٹیں	عصمت چغتائی	۳۰/۰۰
ضدی	″	۱۲/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۵/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	″	۱۵/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	″	۱۵/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	″	۱۲/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	″	۱۲/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس	۱۲/۰۰
امراؤ جان ادا	مقدمہ: تمکین کاظمی	۱۲/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

کلیات اقبال (اردو) — صدی ایڈیشن

اقبال معاصرین کی نظر میں — وقار عظیم

فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم

غالبیات

دیوان غالب

فیض

سرسید

لسانیات و صحافیات

مثنوی

افسانے و ناول

ڈرامے

ادب و تنقید

سیاسیات و تاریخ

متفرق

ایجوکیشنل بک ہاؤس